صوبہ جموں کے ہندو ادبا و شعراء

ڈاکٹر دیواندر گپتا

شورق پبلیکیشن ۱۷۹ رہاڑی کالونی جموں

تاریخ اشاعت ... 1987ء

کتابت .... سیّد راحت حسین

طباعت .... شاردا پرنٹنگ پریس

قیمت .... چالیس 40/ روپے

ملنے کا پتہ :-

شوری پبلیکیشن 179 ریہاڑی کالونی جموّں (توی)

فہرست

تعارف

"صوبہ جموں کے ہندو ادباء و شعراء" اِن تمام باکمال شخصیتوں کا تذکرہ ہے۔ جن کی کوششوں سے ہماری زبان (اُردو) پروان چڑھی اور آج دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہو رہی ہے۔

ادباء و شعراء کے حالات ترتیب دینے میں اعجاز و اختصار کے باوصف جامعیت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، شعراء کے نمونہ کلام کے انتخاب میں جو کاوش کی گئی ہے اس کا اندازہ اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر دیوا ندر گپتا اس نوعیت کی کتاب کو پہلی بار پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

پروفیسر ایس کے ملہوترہ
کوارڈی نیٹر
اے۔ آئی۔ ای۔ جموں

دیباچہ

اِس کتاب میں اُن ادباء وشعراء کا ذکر ہے جو ابھی زندہ ہیں اور برابر لکھ رہے ہیں۔ جن ادباء وشعراء کا ذکر میں نے اِس کتاب میں کیا ہے صرف انھیں کے ذکر سے صوبہ جموں کے ہندو ادباء شعراء کی فہرست مکمل نہیں ہو جاتی۔ جن شخصیتوں کا ذکر کسی وجہ سے نہیں ہو سکا ان کو اسی عنوان سے دوسری جلد میں شائع کیا جائے گا۔ پھر شاید دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھتے وقت ناموں کی یہ کمی محسوس نہ ہو۔

ایک چیز جسے دیکھکر خوشی بھی ہوتی ہے اور نتیجہ نکالنے میں کبھی قائل نہیں ہوتا کہ ہندو اردو زبان کو زندہ رکھیں گے اور اس کتاب کے پڑھنے سے نئی پود کے ناموں کا اضافہ ہوتا رہیگا۔ ہمارے رسائل، اخبارات میں جتنے ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں اکثر ہندو ادباء وشعراء کا ادب بھی نظر آتا ہے۔ جسے پڑھکر پڑھنے والے چونک اُٹھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ دنیا میں اردو زبان صرف مسلمانوں کی ہی ملکیت نہیں ہے۔ میرا مقصد یہ کتاب لکھنے کا یہی تھا کہ زبان اردو ہندوستانیوں کی زبان ہے کسی فرقہ یا ذات کی نہیں

آخر میں شکریہ کا خاص گوار فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اسلئے سب سے پہلے جناب ڈاکٹر ظہور الدین صاحب اور محترم کشوری منچندہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے مخلصانہ مشوروں نے مجھے روشنی دکھائی۔ جناب رتن لال صاحب ڈالے دالھنوں کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ موصوف کی توجہ سے بہت سی سہولتیں ملیں۔

کتاب کے متعلق مخلصانہ رائیں اور مشورے میرے
کے لئے شکریہ کا باعث ہوں گے۔ ممکن ہے میں ان کی
روشنی میں آئندہ کتاب کو اس سے بہتر بنا سکوں۔

احقر

ڈاکٹر دیوا اندر گپتا۔

شناخت

یکم جنوری ۱۹۴۷ء کی ایک صبح کو میری پیدائش تحصیل کوٹلی ضلع میر پور میں ہوئی۔ لوگوں نے شام کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ کیونکہ رنگ کالا تھا مگر گھر والوں نے دلواندر نام رکھا

1972ء میں ایم۔ اے اردو کی ڈگری جموں یونیورسٹی سے حاصل کی۔

1975ء میں بی۔ ایڈ بھی کیا کیونکہ اسکول ماسٹر جو تھا۔

1982ء میں "اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے" پر مقالہ لکھا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری جموں یونیورسٹی سے حاصل کی۔ زندگی میں جس کسی سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس کو اپنا عزیز ترین دوست سمجھا۔ لیکن زندگی کا دوسرا نام فریب ہے اور دوستی ایک فرضی عمل!

ان لوگوں نے اتنی اذیتیں دیں کہ اب اجالے سے مجھے ازلی نفرت ہے، بقول مخمور سعیدی۔

کسی روشنی کے خاطر نکلے تھے اس سفر میں
ظلمت کرے تعاقب اب جائیں ہم کدھر بھی
اس دھوپ میں کہیں ایسا سایہ نہ مل سکے گا
بے برگ ہو چکا ہے امید کا شجر بھی

تنہائی۔ محرومی۔ مایوسی۔ خاموشی اور بے چارگی میری زندگی کے اہم موضوعات ہیں۔ جس طرح نرگس صدیوں سے اپنی بے نوری پر روتی چلی آئی ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنے

وجود کی افسردگی پر رو تا رہتا ہوں لیکن میرے آنسو میری خاموشی میں دب کر ظاہر ہونے نہیں پاتے شاید خلیل الرحمن اعظمی نے یہ شعر میرے لیئے ہی لکھا تھا۔

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں۔
سایہ سایہ پکارتا ہوں۔
جی چاہتا تو بیٹھے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا۔

میرے ذوق سلیم کو نکھارنے میں ڈاکٹر گیان چند جین صاحب ڈاکٹر ظہور الدین صاحب اور جناب منوہر لال دل صاحب کا زبردست ہاتھ ہے۔ ان عظیم شخصیتوں سے مجھے بے پناہ شفقت ملی۔ جس سے میں نے راہ ادب کی روشنی پائی۔ میرے حوالے سے ایک اداریہ 1979ء کو ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے "ہماری زبان" انجمن ترقی اردو ہند میں لکھا۔ لیکن میرا پہلا مضمون "پتھر کی سرگذشت" رنبیر جیوتی جموں میں 1979ء میں شائع ہوا تھا۔ راج ستیاہ۔ ایڈوائیس شیر جیوتی۔ سچ۔ پینتھر سیورک۔ تسکین۔ سندیش وغیرہ جموں کی اخبارات میں میرے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں دوسرے لفظوں میں اب تک جموں کے اردو اخبارات نے مجھے برداشت کیا ہے اور انگریزی روزنامہ EXCELSIOR اور KASHMIR TIMES میں بھی کچھ مضامین شائع

ہوئے ہیں۔
"اُردو تدریس" "اُردو تصنیفی و تالیفی ادارے"
رہنمائے اُردو معلمین" جنہیں ہم کھول نہیں سکتے
(زیر طبع)، وغیرہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں کچھ جموں
کے ہی رسالہ جات نے مجھے جگہ دی اور ریڈیو کشمیر جموں سے
بھی کچھ پروگرام نشر ہوئے لوگ کہتے ہیں کہ کچھ حسرتیں پوری ہوتی
ہیں مگر میری کوئی بھی حسرت ابھی تک پوری نہ ہو سکی جسکو
چاہا وہ میرا نہ بن سکا جس کے دروازے پر دستک دی
اُس نے دروازہ میرے لئے نہیں کھولا۔ جس کو پیار کیا وہ
میرا محبوب کسی اور کی باہوں میں باہیں ڈال کے بیٹھ گیا۔
زندگی بہت زیادہ گزر گئی۔ آگے بھی کچھ خوشی کی امید نظر
نہیں آتی۔

ہائے کس درد کی ضبط کی تلقین مجھے

ہنس پڑے دوست جو بیں نے کبھی رونا چاہا

میرے جیسے انسانوں نے خوابوں اور خیالوں کی وہ دنیا
بنا رکھی ہے جس میں انسانوں کے احساس مسرت اور ذوق
حسن میں اضافہ ہو، میرے ساتھ روشنی، گرمی، ولولہ،
حیات، آزادی اور وسیع النظری کی کیفیات سے جو گزرتا
ہے وہ میری زندگی کو رحم کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور کبھی کبھی

میرے حال پر دو آنسو بہا دیتا ہے۔ میں اکثر یہی کہتا ہوں کہ "اے خدا مجھے یہ خیرات دے کہ میں اپنے آپ کو اس طرح دیکھوں، جیسا ہوں" اور واقعی اس کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے اور اپنے اساتذہ اکرام اور اپنے دوستوں کی طرف نگاہیں لگا کر بیٹھا ہوں کہ شاید مجھ پر کوئی رحم کریں :-

این۔ ڈی۔ سوری

دریائے توی کی شہرت اور جموں کی زینت کو جناب این۔ ڈی۔ سوری جیسے بزرگ و معلم نے چار چاند لگائے ہیں وہ خوش نصیبی سے علم کے آسمان پر ایک روشن ستارے کی طرح چمک رہے ہیں۔ انہوں نے پہاڑی پر واقع جموں شہر کے حسن کو دوبالا کرنے اور اسے دیگر آئین کے لئے پر کشش بنانے کے سلسلے میں جو خدمات انجام لائی ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ دور دور تک مشہور و معروف ہو چکے ہیں۔ نیز ان کی اپنی علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے بھی وہ اطراف واکناف میں اچھی طرح سے جانے پہچانے جاتے ہیں

اُن کا جنم 15 اریوہ سنہ 1935ء بروز اتوار کو کھلونیاں والی گلی (جموں) میں ہوا۔ اُن کے والد صاحب سب انسپکٹر پولیس تھے۔ سوری صاحب کو پنڈت جی کی پاٹھشالہ میں داخل کروایا گیا۔ مگر بقول ان کے "جس کمرے میں بچے بیٹھے تھے اسکے چھت لکڑی کے کھمبوں پر کھڑی تھی۔ میں ایک کھمبے ساتھ جھجوتا رہا۔ شام کو گھر آیا تو چکر آنے لگے اور بخار بھی ہوگیا بخار اُتر جانے کے بعد کئی دن پاٹھشالہ نہ جاسکا۔ جب پھر گیا تو سر درد اور بخار نے آگھیرا۔ اسی طرح سال گذر گیا اور بال اُپدیش (قاعدہ کا نام) بھی ختم نہ کر پایا۔

اسی عرصہ کے دوران میری والدہ نے مجھے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا۔ میں اسکول میں داخل تو ہو گیا مگر کچھ اموات کی وجہ سے قاعدہ کے صفحہ چھ سے آگے نہ جا سکا یعنی کہ قاعدہ ختم نہ کر سکا اور اگلی جماعت کے مستحق نہ بن سکا مگر جب کوئی پوچھتا کیا پڑھا ہے تو کہہ دیتا۔ حق کہو۔ اور مت ڈرو۔ اسی اصول کو اپنا کر اور اب تک پورا اُترا۔

سوری صاحب اس واقعہ کے بعد پڑھائی کی طرف ایسے راغب ہوئے کہ انھوں نے درجہ بدرجہ پڑھائی کی منزلیں اچھے نمبرات سے طے کرنا شروع کر دیں اور کئی جماعتوں میں وظائف بھی حاصل کئے۔

اُس زمانے میں صوبہ جموں کے طلبہ یونیورسٹی کے امتحان دینے کے لئے لاہور جایا کرتے تھے۔ سوری صاحب بھی بی۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی کے امتحان کے لئے لاہور گئے۔ امتحان دینے کے بعد جب 20 جون سنہ 1917ء جموں آئے تو تیسرے دن ہی ان کو استاد کی نوکری عارضی طور پر مل گئی۔ ان کو دو ماہ کی تنخواہ -/۶۰ روپے ملی تھی۔ دسمبر سنہ 1917ء کو سوری صاحب نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے سالے کو پڑھانے کا کام شروع کیا۔ اگر سوری صاحب چاہتے تو کچھ اچھا رتبہ بھی حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے مدرسی کا پیشہ ہی اپنانا مناسب سمجھا اور جولائی 1926ء کو بنارس ہندو یونیورسٹی میں ایل۔ ٹی کی ٹریننگ کے لئے بنارس پڑھنے چلے گئے۔

جموں واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ طلبہ کی خدمت کرتے رہے اور پھر کچھ عرصہ کے لئے ایجوکیشن میں ہی کلرک بن گئے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے کافی کچھ سیکھا مگر تعلیمی ان کا پیشہ تھا اور اس کے لئے ہر حالت سے موزوں بھی تھے وہ اپنے پیشہ یعنی کہ اسکول ماسٹر پھر سے بن گئے سوری صاحب پیدائشی استاد ہیں۔ ان کی شخصیت اور کردار میں ایسا جاہ و حشم اور رعب ہے کہ انھیں دیکھتے ہی احترام اور عقیدت سے خود بخود آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ وہ ان یادگار استادوں میں سے ہیں جو طالب علموں کو پورے خلوص سے صرف اپنا علم ہی نہیں بخشتے بلکہ اپنی شخصیت۔ کردار اور اخلاق کے گہرے نقوش بھی ان کے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی اپنی ساری زندگی ایک طالب علم کی مثالی زندگی ہے۔

محکمہ ایجوکیشن میں ایک آفیسر کے رتبے پر فائز ہونے کے باوجود سوری صاحب نے نہ تو کبھی رشوت یا کمیشن لی اور وہ اپنے ماتحتوں کو ایک ساتھی ہی، ایک دوست سمجھتے تھے ان کی مدد بھی کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ جہاں ضروری ہوتا تاکید بھی کرتے وہ ہر وقت طلبا اور اساتذہ کے بارے میں سوچتے کہ کس طرح ان کے مسائل کو حل کیا جائے اور اکثر وہ ان مقاصد میں کامیاب ہو جاتے۔

تقسیم وطن خون ریزی۔ بربادی۔ قتل و غارت۔ لوٹ مار اپنے ساتھ لائی رفیوجی کیمپ بنے۔ بستری

رنبیر ہائی اسکول بھی ریفوجیوں کی آماجگاہ بنا۔ اس کیمپ کی ذمہ داری جناب سوری صاحب کے سپرد ہوئی کیمپ کی وجہ سے اسکول کی حالت بہت بدل گئی۔ درخت کٹ گئے باغ اجڑا۔ کواڑ لوٹے۔ کمروں کا رنگ وروغن تباہ ہوا۔ دیواریں چولھوں کے دھوئیں سے کالی ہوگئیں ان کے ساتھی استاد اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ اُن کو آگاہ کریں کہ یہ اسکول کا سامان ضائع نہ کریں۔ تو سوری صاحب اپنے ساتھیوں سے کہتے "یہ تو دکھی ہیں دکھیوں کو اگر ڈانٹوں گا تو اور دکھی ہوں گے۔ سوری صاحب ایک واقع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتابوں کی نمائش کا جلسہ تھا جو تین دن تک چلا۔ جموں اور سرینگر کے پبلشرز اور کتب فروش بھی اپنی اپنی طبع شدہ کتابیں لے کر اس نمائش میں شریک ہوئے۔ اسکول ایک سجا سجایا کتابوں کا گلستان بنا۔ انہیں کالج کے طلبا۔ طالبات۔ پروفیسر صاحبان اور اساتذہ نے اپنے اپنے مکالمے پڑھے۔ جموں کے شاعروں نے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو محفوظ کیا۔ جامعہ ملیہ کے پروفیسر مجیب صاحب نے بھی تقریر فرمائی۔ ایک بڑی بات تو یہ تھی کہ ان کتب کی حفاظت کے لئے پولیس کی مدد نہیں لی گئی۔ آٹھ دس استاد صاحبان نے اس کام کو اپنے ذمے لیا۔ دن کو تو حفاظت کی ضرورت نہ تھی رات کو وہ باری باری سے پہرہ دیتے رہے۔ یہ استادوں کا کیریکٹر تھا جو اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔

25 نومبر 1955ء کو رنبیر اسکول جموں سے ریٹائر ہونے کے بعد سوری صاحب نے سناتن دھرم ہائی اسکول جموں میں پرنسپل کا عہدہ سنبھالا اور بغیر تنخواہ کے اسکول میں کام کرتے ہیں سوری صاحب کا اندازِ گفتگو فطری ہونے کے ساتھ ساتھ سادگی اور پرکاری کا مرکب بھی ہے ۔ وہ مخاطب کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کو اتنا موقع دیتے ہیں کہ وہ کھل کر اپنے دل کی بات کہہ سکے اس طرح افہام و تفہیم کی ایک مخلصانہ فضا بن جاتی ہے سوری صاحب دھیمے اور پرکیف لہجے میں مسکرا کر باتیں کرتے ہیں اور مخاطب کا دل موہ لیتے ہیں۔ ان کے اندازِ گفتگو میں مٹھاس، دلدہی، سادگی قناعت کے عناصر گھل ملکر اس کو موثر دلنشین اور مفید بنا دیتے ہیں سوری صاحب کی روزمرہ کی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کی سادگی، نفاست، مروت اور کام کرنے کی لگن ہے یہی اوصاف لوگوں کو متوجہ اور متاثر کرتے ہیں۔ یہ حیرت ناک بات ہے کہ جو شخص ان کے قریب ہوتا ہے وہ ان سے ضرور متاثر ہو جاتا ہے اور اسمیں کام کرنے کی لگن اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے ۔ دراصل سوری صاحب صوفیوں کے طرزِ عمل سے کام لیتے ہیں۔ وہ مشاہدہ و مثال کے علاوہ سمجھانے کا بالواسطہ طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ کام کرنے کو زبان سے کم سے کم کہتے ہیں مگر خود نمونہ بن کر زیادہ سے زیادہ دکھاتے ہیں ان کے اس فطری طرزِ عمل کا اثر خارجی نہیں ہوتا بلکہ داخلی ہوتا ہے۔ ان کے تحریر کی زبان صاف ستھری ہے اس میں تکلیف

اور تصنّع کا نام و نشان نہیں مگر سادگی کے ساتھ جوش، روانی اور تازگی ضرور ہوتی ہے۔ اس میں تسلسل اور بہاؤ دیکھا ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں سے ذہن و فکر کو آسودگی ملتی ہے۔

اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "عہدِ پیری میں شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں، پر کیا کیا جائے۔ جب تک ماضی کی کھڑکیاں اور جھروکے میرے دل کے دالان میں کھلے رہیں گے۔ پُرانی باتیں بھلانے سے بھی نہیں بھولے گی۔ حقیقت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مانتا ہوں کہ حقیقت حیات کی منزلیں کب کی ختم ہو گئیں وہ اب نہ آئیں گی۔ پر ان کی یاد ضرور آئے گی۔" سوری صاحب فارسی، اُردو، سنسکرت اور ہندی کے علاوہ انگریزی میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ اُردو اور انگریزی کے وہ بلند پایہ کے ادیب اور مفکّر ہیں۔ اُردو میں انہوں درجنوں مضامین اور اداریے لکھے ہیں۔

ریڈیو کشمیر جموں سے اکثر ان کے مضامین نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "گو میری زندگی میں بہار اور خزاں اس شدّت سے نہیں آئیں کہ اُن میں بخوبی تمیز و تفریق کر سکوں۔ پھر بھی تو یہ مشاہدہ میں آیا۔ کہ یہ عالمِ رنگ و بو ایک حال پر قائم نہیں۔ یہ ایک بحرِ فنا ہے جس کی طوفانی لہریں اپنے دامن میں ذخیرہ انقلابات پالتی ہیں۔ حادثات اور ہنگامے کہیں اس کا رنگ نکھارتے ہیں۔ جس سے یہ بے حد دلفریب ہو جاتی ہے اور کہیں اسے مٹانے کے درپے۔ جس سے افراد بے زاری میں چیخ و پکار کرتے ہوئے نفسی

کو ہستی پر ترجیح دیتے ہیں۔

بقول سوری صاحب "ہر ایک انسان اپنی نشوونما کا خود ذمہ دار ہے وہ اپنی زندگی کا خود معمار ہے اسلئے ہر ایک فرد بشر پر لازم ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کی جانچ پڑتال کرے جن کے زیر اثر اس کے اعمال ہیں۔ پھر اسے چاہیئے کہ وہ اپنی قوت کردار پر بھروسہ کرکے ان کے جذبات کو اس طرح موڑے توڑے کہ اس کی زندگی زیادہ مفید اور زیادہ قابل قدر ہو سکے۔ اپنے آپ کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے کا یہی طریقہ ہے۔

کامیابی خود نہیں آتی۔ بلکہ لائی جاتی ہے اس کو لانے کے لئے کردار کی ضرورت ہے ورنہ محض انتظار کرنے سے فائدہ؟۔ اسی اصول کے پیش نظر جناب سوری صاحب نہ صرف صوبہ جموں میں بلکہ ہندوستان کی بہت سی ریاستوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

سوری صاحب ان باتوں پر کاربند ہیں کہ

I محنت اور مزدوری زندگی کی تلخ ترین حقیقت ہے۔

II خوف کے مقابلہ کے لئے صرف ایک ہی حربہ کافی ہے وہ ہے "قوتِ کردار" جو ہماری راہ نمائی کرتی ہے۔

III روپیہ تمام ممکن برائیوں کی راہ میں ایک روک ہے،

صوبہ جموں کے لئے سوری صاحب روشنی کا ایک بڑا امتیاز ہیں وہ ہمارے گوہر شب چراغ ہیں۔ وہ ادبی

رہنما۔ بغض وکدورت سے پاک، ایثار نفس، دوسرے کے حقوق کا پاس رکھنے والے، تعلیم و تہذیب کے زیور سے آراستہ۔ خوش خلق اور نیک کردار کی شخصیت ہیں اُنہوں نے ہمیشہ اپنے شاگردوں کو محبت و شفقت، تحفظ مقبولیت، قدر شناسی اور ذمہ داری کا سبق دیا ہے تاکہ وہ راہ راست سے نہ بھٹکے اور حق و صداقت کی راہ پر ڈٹے رہیں۔

مبارک ہے وہ ماں جس نے کیا ایسا پسر پیدا

کشوری منجندہ

ہر انسان اطلس و کمخواب اور گلاب کی پتیوں کے لمس سے پیدا ہونے والے نرم نرم احساس، خوشی، راحت و آرام اور عزت و توقیر کا خواہشمند ہوتا ہے اور یہ سب حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی بساط کے مطابق کوشش بھی ضرور کرتا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سب دولت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ ہر جائز و ناجائز ذریعے، اخلاقی پستی اور دھوکا دفریب سے دولت حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے دولت حاصل کر لینے پر بھی انسان یہ سب حاصل نہیں کر پاتا کیونکہ دولت انسان کو مادی آسائشیں تو ضرور مہیا کر سکتی ہے لیکن سکون قلب اور وہ سچی خوشی اور عزت و توقیر ہرگز نہیں دے سکتی جس سے وہ نرم نرم احساس پیدا ہو جائے جو روح کے نہاں خانوں کو روشنی، سرخوشی اور سرمستی کی شعاعوں سے منور کرتے ہوئے انسان پہ وہ وجدانی کیفیت طاری کر دے جو انسانیت کا طرہ امتیاز ہے۔

اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے انسان اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ کشوری منجندہ بھی اپنے بائیس سالہ سرکاری ملازمت کے ریکارڈ کے مطابق 2 مارچ سنہ ۱۹۲۹ء کو

جبکہ جنم پتری اور گھریلو ریکارڈ کے مطابق 2 مارچ 1931ء
کو اس جہانِ فانی میں وارد ہوئے۔ باقی رہی ان کے درست
سن پیدائش کی تو اب جیسا کہ وہ 2 مارچ 1929ء کے
مطابق ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ دو برس کے آگے
پیچھے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ویسے یہ اکثر دیکھا
گیا ہے کہ آج سے نصف صدی یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ
پیشتر اکثر والدین اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے میں دلچسپی بھی
نہیں لیتے تھے۔ لیکن کئی والدین بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ
کرنے کے اتنے شوقین ہوتے تھے کہ انھیں اسکول میں داخل
کروانے کے لئے ان کی عمر اکثر زیادہ ہی لکھوا دیتے تھے بہرحال
کشوری سنچندہ آج سے کم از کم 55 برس پہلے مندروں اور
پتھروں کے اس شہر میں اپنے والدین شریمتی اور شری بی۔ ایم
سنچندہ کے ہاں ہوئے جسے راجا جامبو لوچن نے بسایا تھا اور جو
جموں کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی پیدائش کے بعد ہی ان کی
والدہ محترمہ بیمار رہنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پرورش کا بوجھ
ان کی اکلوتی ہمشیرہ جو اس وقت سولہ سترہ برس کی تھی کو
اٹھانا پڑا۔ بچپن جیسے عام لوگوں کا گذرتا ہے۔ معصوم شرارتوں
میں گزرا لیکن "دو تھپڑ لگیں" دماروں کی دو تھپڑ) کے یہ تین
الفاظ جو ایک جواں عورت نے کہے تھے ان کے ذہن سے ایسے چپکے
گئے کہ باوجود کوشش کے یہ انھیں بھلا نہیں سکتے 49 سال پیشتر
ان کے مکان کی نچلی منزل میں ایک جواں میاں بیوی کرایے پر

آکر رہنے لگے تھے۔ وہ صرف دو ہی تھے اور ان کے ساتھ کوئی بچہ وغیرہ نہیں تھا۔ اتفاق سے اُس عورت کی شکل و صورت ہنپچندہ صاحب کی بہن سے ملتی جلتی تھی۔ جو اس وقت مغربی پنجاب کے شہر راولپنڈی میں بیاہی جا چکی تھی اور دو بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی، بہن کے سسرال چلے جانے پر یہ اُس کی کمی شدّت سے محسوس کرنے لگے تھے بے اختیار اُس عورت میں دلچسپی لینے لگے اور وقت بے وقت اُس کے کمرے میں جا ٹپکتے تھے جس کا وہ کبھی کبھی بہت بُرا مناتی تھی ایک مرتبہ تو ہاتھ اُٹھا کر "دو چھوڑ گئیں" کہتے ہوئے مارنے کو بھی دوڑ پڑی۔ تو وہ الفاظ کچھ اسطرح معصوم ذہن میں گڑ گئے آج اس عمر کو پہنچ کر بھی انھیں ذہن سے جھٹک نہیں پائے ہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ پرائمری اسکول سے نکل کر ہائی اسکول میں جا پہنچے میٹرک کا گولڈن ٹیسٹ ہو چکا تھا۔ پرچے واپس مِل رہے تھے۔ انگریزی، ڈرائنگ اور تاریخ جغرافیہ میں نمبر اچھے تھے جبکہ حساب اور سائنس میں نسبتاً کم تھے۔ اب انہیں اُردو کے پرچے کا انتظار تھا اور بہت ہی اچھے نمبروں کی امید تھی۔ لہٰذا جب پرچہ ملا تو بیتابی سے "شہری اور دیہاتی زندگی" پر ملے نمبروں کا شمار کرنے لگے لیکن 25 نمبر کے سوال پر ملے 39 نمبر اور آخر میں لکھے گئے ریمارکس "آپ تو ادیب معلوم ہوتے ہیں"۔ دیکھکر ہنپچندہ صاحب حیرت کے سمندر میں غرق ہو گئے ذہن میں بے اختیار یہ سوال اُبھر آیا کہ یہ ادیب کیا بلا ہوتی ہے

تب اس کے بارے جانکاری حاصل کرنے کے لئے استادِ محترم کے پاس جا پہنچے۔ جنہوں نے نہ صرف ادیب سے متعلق جانکاری ہی دی بلکہ ادب کے میدان میں کامیابی کی دعا بھی کی۔

جہاں تک ادبی میدان میں اترنے کا تعلق ہے کشوری منچندہ صاحبہ "دیہاتی اور شہری زندگی کا مقابلہ" کے مقالے سے ہی ادبی میدان میں کود پڑے تھے۔ جس کی تنقید اور تائید ان کے اردو کے استاد مولوی نصیر الدین نے کر دی تھی، پھر اس کے چند ماہ بعد ہی سالانہ امتحان میں شرکت کے بعد ان کو کارزار زندگی میں کود جانا پڑا۔ آپ پوچھیں گے وجہ؟ تو حضور یہی تھی کہ ۱۴ سال کی عمر میں ہی ان کی شادی کر دی گئی،

اُس وقت جب ملک میں آزادی کے چرچے ہو رہے تھے اور عوام میں ایک عجیب طرح کا جوش پایا جاتا۔ ملک آزادی کے مندر کی دہلیز پہ کھڑا آزادی کی دیوی کے دیدار کے لئے بے چین و بے قرار ہو رہا تھا۔ انھیں غلامی کی زنجیر دل میں جکڑ دیا گیا اور ذمہ داریوں کا بے پناہ بوجھ ڈال دیا گیا۔ ملک تقسیم ہو گیا، جس سے ان کے والدین کی مالی حالت پتلی ہو گئی۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ پیٹ بھرنا بھی مشکل ہو گیا۔ مجبور ہو کر انہوں نے چھوٹا سا کام شروع کر دیا اور زندگی کی گاڑی گھسیٹنے لگے۔ لیکن باوجود مشکلات کے ادب سے ناطہ نہیں ٹوٹ سکا۔ شاید اسی لئے ہی جموں و کشمیر یونیورسٹی کے ادیبا فاضل کا فارم بھر دیا گیا اور اسی بہانے کچھ ادبی کتابیں پڑھنے

کاموقعہ مل گیا۔ امتحان ہوا اور ۶۷ فیصدی نمبر لیکر ادیب فاضل ہو گئے اور پھر اس ادیب فاضل کے طفیل اپریل سنہ 1962ء میں ۹۰-5-50 کے گریڈ میں اُردو کے استاد بنا دیئے گئے۔ پھر ملازمت کے دوران ہی بی۔ اے۔ بی۔ ای سی، بی۔ ایڈ اور ایم اے اُردو (سیکنڈ کلاس) ہو گئے اور پھر ۳۱ مارچ سنہ 1984ء کو ملازمت سے سبکدوش کر دیئے گئے،

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کوئی پرائیویٹ ملازمت اختیار نہیں کر سکے۔ لکھنے کے شوق اور اُردو کی خدمت کے جذبہ نے اخبار نویسی کی جانب مائل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ ہفت روزہ اخبار "بازگشت" کے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر ہیں۔

اب جہاں تک ان کی ادبی سرگرمیوں کا تعلق ہے معاشی مشکلات سے جھوجتے ہوئے، بیوی بچوں کی ذمہ داریاں نبھاتے اور نام نہاد رشتہ داروں اور دوستوں کی جانب سے لگائے گئے زخموں کو برداشت کرتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے۔

جموں میں چل رہی ادبی انجمنوں خصوصاً "بزم فروغ اردو" اور "انجمن ادب" کے دو دفعہ سال جنرل سیکریٹری رہے اور خود کو منواتے رہے غالباً سنہ 1967ء سے ریڈیو پروگرام ملنے شروع ہو گئے۔ جن میں ان کے کچھ قابلِ تعریف افسانے نشر ہوئے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) میرا ساتھی میرا دوست (2) بے وفا (3) سانپ (۴) دستک (۵) میری نئی کہانی (۶) کہانی کا المیہ

(7) پھر وہی مصیبت (8) نئی زندگی نہ صرف ریڈیو والوں نے منجندہ صاحب کا احترام کیا بلکہ جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی والوں نے بھی اُن کی حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ہی مالی معاونت بھی کی۔ اسی دوران ــــ روزنامہ تیج دہلی ، ہفتہ روزانہ سویرا روزنامہ پرتاپ ، ملاپ " اور دیگر پردیپ میں مختلف موضوعات پر مضامین چھپنے لگے۔ پہلا افسانچہ تھا لباّ قلم آرٹ ویکلی دہلی یا ہفتہ روزہ "سویرا" دہلی میں شائع ہوا۔ "ساحرہ" نامی ایک افسانچہ شہزادہ تبسم کی مرتب کردہ افسانوی مجموعے "حوا کی بیٹیاں" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف رسائل اور اخبارات میں ان کے افسانے نظر آنے لگے۔ جن میں سرکاری اور غیر سرکاری جریدے بھی شامل ہیں۔ مارچ ۱۹۷۶ء میں ماہنامہ آجکل (نئی دہلی) نے ملک گیر افسانوی مقابلے کا اہتمام کیا تو اس مقابلے میں ان کے افسانے گرد کی دیوار دوسرے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔

کشوری منجندہ کبھی کبھی شوقیہ شاعری بھی کر لیتے ہیں۔ ایک غزل جس کا قطعہ

غموں کی دھوپ میں منجندہ صاحب
سیاہی پہ سفیدی آ گئی ہے۔

اور پچاس کے قریب آزاد نظمیں بھی اس وقت تک لکھ چکے ہیں جن میں سے بہت سی مشاعروں میں پڑھی بھی جا چکی ہیں اور عوام سے داد بھی پا چکی ہیں۔

جہاں تک منچندہ صاحب کے افسانوی مجموعوں کا تعلق ہے
ان کا پہلا افسانوی مجموعہ" اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"
1947ء میں چھپا۔

ہرے پودے بنجر زمین ۔ 1948ء
سڑک انصاف کرتی ہے۔ 1971ء
احساس کے گھاؤ 1978ء
شکست آرزو 1980ء
تکونِ کرب 1982ء
اور کہرے کی وادی 1985ء

اب جہاں تک کسی سے متاثر ہونے کا سوال ہے ادبی لحاظ سے انہیں کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے افسانے متاثر کرتے رہے ہیں اور یہ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے رہے۔ لیکن جہاں تک ان کے افسانوں پر ان کے اثر کا تعلق ہے آج تک ان کے کسی بھی ناقد نے یہ بات نہیں لکھی۔
مثال کے طور پر چند حضرات کی رائے، ذیل میں درج کی جاتی ہے،

"کشوری منچندہ سادہ اور سلیس زبان لکھتے ہیں ان کی ہر بات پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔"
(روزنامہ ہند سماچار جالندھر)

"کشوری منچندہ ریاست کے جانے مانے کہانی کار ہیں، وہ پہلے ہی اردو ادب سے متعارف ہیں۔ ان کا اپنا ایک انفرادی رنگ ہے۔ انہیں افسانہ نگاری پر بھرپور گرفت حاصل ہے"

(شیرازہ سرینگر۔ پریم چند نمبر)

"کشوری منچندہ جیتے جاگتے کرداروں کے افسانے لکھتے ہیں وہ سیدھے سادھے الفاظ میں بات کہنے میں کمال رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں سادگی کے ساتھ ساتھ دلکشی بھی ہے۔ وہ افسانے کی تکنیک اور تنوع سے واقف ہیں۔"

(روزنامہ رفتار جموں)

"جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں جن افسانہ نگاروں نے قابل قدر اضافہ کیا ہے ان میں کشوری منچندہ کا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ کئی برسوں سے محنت، لگن اور خلوص کے ساتھ اس گلشن کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ ان کی لگن عبادت سے کم نہیں۔ اس بات میں مبالغہ آمیزی کا شائبہ نہیں کہ ان کے افسانے ملک کے معیاری اور مقبول رسائل میں جگہ پاتے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرح ان کے ہاں فن اور صحت زبان سے بے راہ روی نہیں۔ ان کی شوخی میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے۔

اگرچہ اُن کی منزل ابھی دور ہے۔
لیکن یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اُن کا ہر
قدم درست سمت میں منزل کی طرف رواں ہے"

(عرش صہبائی ۱۷ اکتوبر 1982ء)

ماسٹر موہن لال گپتا

جموں کے کنڈی علاقہ چھنی ہمت میں جہاں دھرتی فصلوں
کی اپج میں بخیلی کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ وہیں
عرش پر ایک ستارہ لوٹا
ایک نئی زیست کی تخلیق ہوئی

ماسٹر موہن لال گپتا صاحب ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کو جموں
شہر سے 5 کلو میٹر دور ایک گاؤں چھنی ہمت میں پیدا
ہوئے۔ کنڈی علاقہ کے پچھڑے ہوئے اس گاؤں نے
ایک ایسے بچے کو جنم دیا جس نے بڑے ہو کر اپنی علمی قابلیت
انسان دوستی اور شرافت کی وجہ سے اس گاؤں کا نام
شمالی ہندوستان میں روشن کر دیا۔ اب جب کبھی اس
گاؤں کا کہیں ذکر ہوتا ہے۔ تو ماسٹر موہن لال گپتا صاحب
کا نام پہلے آتا ہے۔

ماسٹر صاحب کے والد کا نام لالہ نرائن داس تھا۔
وہ فارسی کے بڑے عالم تھے۔ رامائن انھیں زبانی یاد تھی
گاؤں کے پرانے بزرگوں کے کہنے کے مطابق لالہ جی رات یا دوپہر
کے وقت گاؤں کے ڈنگے پر بیٹھ کر اونچی آواز میں لوگوں
کو رامائن سنایا کرتے تھے۔

ماسٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر سے ہی شروع کی تھی
ذرا ہوش سنبھالا تو پرائمری اسکول چھنی ہمت میں داخلہ
لے لیا۔ ابھی چہارم ابھی میں تھے کہ ان کے شفیق والد کا
سایہ سر سے اٹھ گیا اور پرورش کی ذمہ داری ان کے
بڑے بھائی لالہ بیلی رام کے سپرد ہوئی۔ پانچویں جماعت
میں انھیں نے تعلیم سید غلام جیلانی شاہ سے حاصل کی۔
شاہ صاحب اپنے زمانے کے مشہور و معروف استاد تھے
1926ء میں نویں اور سنہ 1928ء میں انھوں نے دسویں جماعت
کا امتحان پاس کیا اور پھر لاہور تشریف لے گئے۔ وہاں
اردو زبان وادب کے نامور پروفیسر محمد باقر اور شاعر
مشرق ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال کے لیکچر سنتے سنتے اردو
کا شوق بڑھنے لگا اور اسی شوق کے بل بوتے پر اردو کے
تینوں امتحانات ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل
میں نمایاں کامیابی حاصل کرلی۔

لاہور میں ماسٹر صاحب نے شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد
اقبال اور نامور ادیب پروفیسر محمد باقر سے ملاقات کی
تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے پنڈت گوپی چند بھارگو
لالہ بھیم سین سچر۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا اختر علی خاں،
ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ڈاکٹر ستیہ پال۔ لالہ اچنت رام
سردار سیر و دول سنگھ کولیشر۔ لاڈورانی زتشی اور دیگر
سرکردہ شخصیتوں کے ساتھ قید وبند کی مصیبتیں بھی جھیلیں

مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے پوتے اور مولانا اختر علی خاں کے صاحبزادے جناب منصور علی خاں سے ان کی ملاقات "بورسٹل جیل لاہور" میں ہوئی تھی۔ جناب منصور علی خاں اُس وقت نوجوان کانگریسی ورکر کی شکل میں ابھر رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کو پنجابی کے مشہور شاعر مجاہد آزادی جناب رام بھایا طائر بہت عزیز رکھتے تھے۔ ماسٹر صاحب اکثر جلسوں اور جلوسوں میں ان کی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔

ماسٹر صاحب کو وردھا ٹریننگ کے دوران راشٹر پتا مہاتما گاندھی، ہندوستان کے پہلے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد، سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں، ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو، شریمتی وجے لکشمی پنڈت، جناب آچاریہ کرپلانی۔ جناب مولانا ابوالکلام آزاد، بلبل ہند محترمہ سروجنی نیڈو سردار وجھ بھائی پٹیل۔ جناب بھولا بھائی ڈیسائی۔ جناب مہادیو ڈیسائی اور جناب ونوبا بھاوے جیسی نامور ہستیوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے اور سیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

ماسٹر صاحب کو ۱۹۵۶ء میں ریسرچ اینڈ پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے پہلی آٹھ جماعتوں کا سلیبس تیار کرنے والی اردو کمیٹی کا ممبر چنا گیا ۱۹۱۵ء میں ماسٹر صاحب 36 سالہ ملازمت کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے بعد ریٹائر ہو گئے۔ 66-1965ء میں ماسٹر

صاحب بطور اردو لکچرار گورنمنٹ کالج فار ووِمن پریڈ گراؤنڈ جموں میں تعینات ہوئے۔ اور ۸ مئی ۱۹۷۷ء میں کالج سے آل انڈیا یونیورسٹی اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن ڈیپارٹمنٹ آف اردو یونیورسٹی آف دہلی کانفرنس میں شمولیت کی۔

۵ مارچ ۱۹۷۰ء کو بورڈ آف اسکول سٹیڈیز فار اردو کا ممبر جموں یونیورسٹی نے مقرر کیا۔

۱۰ مئی ۱۹۷۵ء کو ماسٹر صاحب نے اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے "فرزی گپتا اردو کالج چھنی ہمت" کی بنیاد رکھی۔ یہ کالج آج بھی جموں صوبہ کے طلبہ کی خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ اس کالج کا افتتاح ڈپٹی سپیکر جناب ہیرا نند جنڈیال صاحب کے ہاتھوں ہوا تھا۔

۱۹۷۹ء میں ماسٹر صاحب نے دو سال تک کم از کم ڈھائی سو کے قریب ہائر سیکنڈری، ہائی اسکول، موسٹ ہائی اسکولوں۔ مڈل اسکولوں، سنٹرل اسکولوں اور پرائمری اسکولوں کا دورہ کیا۔ دورے کے دوران آل انڈیا ٹور کے بارے میں اپنے تاثرات جغرافیائی، تاریخی، سماجی، اخلاقی، صنعتی، تمدنی، زرعی اور معدنی نقطہ نظر سے سینکڑوں اساتذہ اور ہزارہا طلبہ کے سامنے پیش کئے اور انھیں اپنے آل انڈیا ٹور سے مستفید کیا۔ ان اسکولوں میں آنے جانے کے اخراجات ماسٹر موہن لال گپتا صاحب نے خود برداشت کئے۔ ماسٹر صاحب اب بھی اپنے پیدائشی گاؤں

میں اردو کے طلبہ کو مفت تعلیم دے رہے ہیں۔ جامعہ اردو، علی گڑھ کے تینوں امتحانات ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے علاوہ ایم۔ اے اردو، ایم۔ فل، پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ بھی ان سے مستفیذ ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی کے امتحان ادیب فاضل کے طلبہ کو بھی اردو کی تعلیم مفت دیتے ہیں۔ ماسٹر صاحب فیاض اتنے ہیں کہ ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ ماسٹر صاحب خاص کر اردو کے طلبہ سے کچھ بھی نہیں لیتے بلکہ انہیں کتابیں بھی مفت فراہم کرتے ہیں۔ بقولِ آنند لکھنوی

اے گلِ خنداں چمن میں مسکرائے جا یونہی
مسکراہٹ ہے تیری یہ، راحت قلب و جگر

ماسٹر صاحب نے نہ صرف کانگرس کی، طلبہ کی، بلکہ زبان اردو کی خاص خدمت کی ہے۔ انہوں نے اس زبان کی ترویج و ترقی کے لئے جو کام سر انجام دیا۔ یاد رہے رہیں گے۔ اس لحاظ سے شائد بابائے اردو کے بعد ماسٹر صاحب کا ہی نمبر آتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے نہ صرف پڑھانے کا ہی کام کیا بلکہ سو سے زائد چھوٹی بڑی علمی و ادبی کتابیں لکھیں اور اب بھی اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔

۱۔ منبع صرف نحو	1939ء
2۔ ہاتھ کا کاغذ	1946ء
3۔ کامیابی کی کنجی	1952ء
4۔ گائیڈ ادیب فاضل، کشمیر یونیورسٹی	1956ء
5۔ ایف۔ اے اردو اوپشنل گائیڈ	1959ء
6۔ بچوں کے مضمون	1961ء
7۔ شیشہ ادب (مضامین)	1962ء
8۔ راہ نمائے اردو (میٹرک)	1963ء
9۔ گائیڈ ادیب فاضل	1964ء
۱۰۔ گپتا ریسرچ سیریز	1965ء
۱۱۔ گائیڈ تلک ڈوگری	1965ء
12۔ خلاصہ گلستان نثر و نظم	1966ء
13۔ اردو۔ ٹی۔ ڈی۔ سی گائیڈ	1966ء
14۔ نیولائٹ گرامر اینڈ کمپوزیشن	1966ء
15۔ ادیب فاضل گائیڈ پنجاب یونیورسٹی	1966ء
16۔ ڈراما انارکلی پر تبصرہ	1968ء
17۔ میری تین دھام یاترا	1969ء
18۔ بھگتی کا یگ	1976ء
19۔ گائیڈ ادیب ماہر	1982ء

گپتا صاحب کے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد سینکڑوں مضامین اردو اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اور عوام سے داد پاتے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ریاست جموں و کشمیر میں متعدد انگریزی روزناموں میں بھی ان کے مضامین اور سوانح حیات اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

اُن کے ایک شاگرد قریشی نے "گمنام شخصیت" کے عنوان سے ایک کتاب بھی شائع کی ہے جس میں ماسٹر صاحب کی خوبیوں اور کارناموں کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔

بدری ناتھ پوری

پونچھ کے ایک سیاسی کارکن کی زندگی کے حالات مخفی
اسقدر ہیں کردہ جس کا اسم گرامی چودھری بدری ناتھ ہے۔
ایک کھتری دنش سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج سے اٹھتر سال
پہلے وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں 2 راکتوبر سنہ 1908ء کو پیدا
ہوئے۔ غالباً "اُس روز پیدا ہونے والا ہر بچہ قومی خدمت میں
اپنی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس
بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مہاتما گاندھی اور لال بہادر
شاستری جیسی ممتاز شخصیتیں 2 راکتوبر کے ہی روز مختلف
سن عیسوی میں پیدا ہونے کے باوجود ساری زندگی دیش
سیوا میں گزارنے کے بعد آخرت کو حاصل کر سکے

جب یہ چھوٹا سا بالک تیرہ سال کی عمر تک پہنچا تو والد کی
مالی پریشانیوں کے کارن زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا بلکہ
پیٹ پالنے کی خاطر اُسے بہت کم تر ملازمتوں میں اپنا بچپن
گزارا۔ یہ بڑی دردناک کہانی ہے جو اس عمر رسیدہ شخص
نے "درد کی لہر" نامی اپنی زندگی کے حالات میں لکھی ہے،
جو تین سو مضمون پر مشتمل ہے۔ سترہ سال کی عمر میں اسکا
ستارہ بلند ہوا، اور اس کی ذہنی صلاحیتوں کا چراغ روشن
ہوگیا جب وہ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہوا۔ انیسویں سال

اس کی شادی ہوگئی اور پھر اس کی دھارمک وسیاسی زندگی کا آغاز شروع ہو گیا۔

اُس نے دس سال کی عمر میں شاکاہاری بننے فیصلہ کیا تھا۔ دھارمک جذبات زوروں پر تھے۔ وہ بیہودہ رسم درواج اور دقیانوسی گوروڈم کا زبردست مخالف بنا اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہ روشن ضمیری جو اُسے لوکمانیہ تلک سوامی دیانند اور سباشہ بیکدام کی تصنیف شدہ کتابوں سے ملی۔ اُسے جلد ہی کشمیری ہندو سبھا یک سبھا اور شری سکھدیو سناتن دھرم سبھا میں بطور سیکریٹری نامزد کیا گیا۔ جہاں اُس نے کچھ سماجی اصلاحات نافذ کرنے میں بڑے تدبر سے کام لیا۔ سردار بھگت سنگھ کی المناک موت کے بعد جنگ آزادی کا ایک مجاہد بننے کے لئے اُس نے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

سن ۱۹۳۱ء کے خونچکاں واقعات نے ریاست جموں وکشمیر کی اقلیتں کے لئے وہی مسائل پیدا کر دیے۔ جو فروری سن ۱۹۸۶ء میں دوبارہ رونما ہوئے ہیں۔ تب بھی اقلیتیں جان بچانے کے لئے ہجرت پر مجبور ہو گئی تھیں سیرپور جل گیا تھا۔ سنتہ، کوٹلی اور پھمبر انتہاپسندوں کا نشانہ بنکر ویران ہو گئے تھے۔ اکثریتی طبقہ کے لوگوں نے اجتماعی طور پر اقلیتوں کو اپنے گھروں سے بھگا دیا تھا مسلم لیگ نے جس طور پر متحدہ بنگال میں سن ۱۹۴۶ء میں عمل کیا تھا۔

شائید وہ ثانوی مثال تھی اور پھر یہ بغاوت کی آگ پونچھ میں
بھی زوروں سے بھڑک اُٹھی۔ مینڈھر۔ سمتر انی۔ دھرم سال
ہرنی اڑی۔ درابہ۔ سورن کوٹ، ہاڑی مرہوٹ اور گونتھل
سب کے سب گاؤں اقلیتوں سے زور زبردستی خالی کرائے گئے
ایسی حالت میں شہر کی بھی اقلیتیں بے یار و مددگار ہو گئیں خود
مملکت کا سربراہ باغیوں سے چھپ کر جان بچانے کے لئے
قلعہ نشین ہو گیا۔

ایسے عالم میں یہ چھوٹا سا نوجوان آگے بڑھا اور ان لرزتی
دیواروں کو گرنے سے بچانے کے لئے اُس نے ایک نعرہ لگایا
موت سے مت ڈرو۔ آؤ میرے ساتھ میں تمہیں زندہ رہنے
کا طریقہ سکھاؤں گا۔ لوگوں نے جوق در جوق اس نوجوان
کا ساتھ دیا۔ اُس نے ہندو سبھا کے نام سے ایک جماعت کو
استوار کیا اور اس کے اسٹیج پر سے جب اُس نے پہلی بار
حکومت کی غفلت شعاری اور اکثریتی طبقہ کے مظالم کے
خلاف ایک موثر آواز بلند کی۔ تو لوگوں نے اس کی رہنمائی
کو قبول کر لیا۔ اُس نے جلد ہی پونچھ میں رہنے والی اقلیتوں کو
ایک اسٹیج پر لا کر منظم کیا۔ اس کے لئے اُس نے پونچھ کی چاروں
تحصیلوں میں گھوم کر ہندو سبھا کی شاخیں قائم کیں۔ اجڑے
ہوئے مکانات میں اقلیتوں کو دوبارہ بسائے جانے کے لئے
اُنہیں حکومت سے مالی امداد دلائی۔

جب مہاراجا کے اس اعلان سے کہ وہ پرجا سبھا قائم

کرکے عوام کو نمائندگی دی گئی۔ فضا کو یکسر بدل دیا۔
ہندوستان بھر سے مجلس وار اور جماعت احمدیہ کی جھنڈیاں
ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد جب پریس کو آزادی ملی۔ تو یہ وہ
پہلا فرد تھا جس نے پونچھ میں لیتھو پریس قائم کرکے ایک
ہفتہ وار جریدہ اپنے ایک اور ساتھی سے ملکر نکالا یہ
جریدہ "پربھات" کے نام سے مشہور تھا۔
اخبار کی نشر و اشاعت جلد ہی ایک باوقار پوزیشن
حاصل کر گئی اور ممتاز کارکن کی قلمی استعداد کا لوگوں پر
گہرا اثر ہوا۔ دیکھا دیکھی اور بھی اخبارات اشاعت پذیر
ہوئے۔ ادبی دنیا میں یہ تسلیم کیا گیا کہ ان کی بستر کہ مجلس
کا صدر اس نوجوان کو بنایا جائے۔
اس نوجوان نے 1933ء میں گاندھی جی کے مرن برت
کے موقعہ پر ہریجنوں کو دیو مندروں اور مقدس چشموں سے
پانی بھرنے دیوتاؤں کے درشن کرنے کا حق اپنی رہنمائی میں
دلایا 1936ء کی بھیانک آگ میں اس نے دونوں فرقوں
کے مظلوم انسانوں کو سرکار سے زر نقصان دلانے کے لئے
پبلک لیگ کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت کی داغ بیل
ڈالی 1939ء میں جب پونچھ کے بیوپاری طبقہ مرکزی آرڈیننس
کے چکر سے پریشان ہو کر راہ نجات تلاش کر رہے تھے تو اس نے
ان لوگوں کو بھی منظم کرکے بیوپار منڈل نام کی ایک جماعت استوار
کی۔ جس کا وہ خود جنرل سیکرٹری تھا۔ اور اسی جماعت کی منظم

طاقت کو ایسے طریقہ پر استوار کیا کہ کوئی بھی شخص اب ان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرتا تھا۔

۱۹۴۶-۴۷ء کے خونچکاں واقعات میں بھی یہ شخص کسی طور پر بھی لرزہ براندام نہ ہوا۔ بلکہ اس نے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لیے نیشنل کانفرنس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اور پھر اس جماعت کی اس ڈھنگ سے رہنمائی کی کہ فوجی حکام بھی ان کی صلاحیتوں کی داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں فوجی راج میں بحیثیت ایک ایک مشیر کے اپنے پاک اور بے لوث جذبہ کا جس طور سے اظہار کیا۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے لوگوں کو ڈھیر زخ دیا، ان کو روز مرہ کی ضروریات زندگی بسر کرنے، بیواؤں اور یتیموں کو کپڑے مہیا کیا بے گھر بے در لوگوں کو رہائشی مکانات الاٹ کرائے۔ ہزاروں مہاجرین کو جموں بھجوایا اور خود طوفانی بارشوں، کڑکتی دھوپ میں ہوائی اڈہ پر موجود رہ کر ان کے انخلا کی نگہداشت کرتے رہے۔ ہزاروں مردہ مویشیوں کو جو ایک مہلک بیماری کا شکار ہو گئے تھے۔ دفنانے اور دشمن کی مسلسل گولہ باری کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں اپنے ترکش کے آخری تیر بھی استعمال کرنے سے پیچھے نہیں رہے۔ پوری صاحب اعتدال پسند۔ لوگوں کے سچے ہمدرد، ستم رسیدہ انسانوں کے بہی خواہ اور مصیبتوں سے نہ گھبرانے والے فرد ہے۔

انھوں نے پونچھ میں نیشنل کانفرنس کی جڑوں کو استوار کیا
اب اُس کا رنگ و روپ بالکل بدل چکا ہے۔ اُنہوں نے
گاؤں گاؤں میں دیہی کمیٹیاں حلقہ کمیٹیاں اور تحصیل کمیٹیاں قائم
کیں۔ اُنہیں صرف تین ماہ کے لئے تحصیل حویلی کی کمیٹی کا نامزد
سیکریٹری بنایا گیا۔ لیکن ان تین مہینوں میں اس شخصیت نے
وہ کام کیا کہ حکومت کو ان کے مشوروں پر کام کرنا پڑا۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کئی حاسد پیدا ہو گئے
اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ انھیں اقتدار کی چابی سپرد کی جائے
شاید وہ ان کی عظیم قابلیت اور تجربہ سے لرزاں تھے لیکن
اُنھوں نے ان باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ مگر پوری صاحب
کو اس سیاسی زندگی سے بدترین مالی نقصانات کا خمیازہ اُٹھانا
پڑا۔

1953ء میں لوگوں نے انھیں ایک بار پھر سناتن دھرم کا
صدر چنا۔ ایک سال کے عرصہ میں ہی انھوں نے اس جماعت
کی گرتی ہوئی ساکھ کو دوبارہ استوار کر دیا۔

1965ء کی ہولناک جنگ میں انھوں نے لوگوں کے گرتے ہوئے
حوصلوں کو دھیرج بندھایا۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں
تین ماہ تک گھر سے بے گھر ہو کر درہ حاجی پیر
کے لوگوں کو ضروریاتِ زندگی لیا کہیں جب کوئی دوسرا فرد اس
کام کے لئے تیار نہ تھا۔

1958ء میں وہ پونچھ میونسپل کمیٹی کے نامزد ممبر بنے۔ مسلسل چھ
سال تک وہ اس کمیٹی میں بحیثیت آنریری سیکرٹری کام کرتے
رہے۔ انہوں نے محاسب میں کمی کرنے آمدنی میں اضافہ کرنے،
شہر کی تعمیر و ترقی میں نمایاں رول ادا کرنے کا فریضہ سرانجام
دیا۔ گلی کوچے پہلی بار استوار کرائے گئے۔ پانی کی بہم رسانی
میں ہر طرح سے امداد دی۔ انہوں نے مختلف سپاناموں کے ذریعہ
پونچھ میں ڈگری کالج کھولنے، ڈسٹرکٹ اسپتال بنوانے،
سڑکوں۔ پلوں اور مختلف دیہات میں ہائی اسکوں، مڈل اسکول
اور پرائمری اسکولوں کا جال بچھا دیا۔ بے روزگار نوجوانوں
کو ملازمتیں دلائی۔ الغرض سینکڑوں مسائل کو اپنی قلمی جنبش
سے ابھارا۔ اور کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔
انہوں نے 1964ء میں کانگرس میں شمولیت کی لیکن 1975ء
میں اس سے مستعفی ہو گئے۔ 1971ء کی جنگ میں وہ امن
کمیٹی کے صدر تھے۔ انہوں نے لوگوں کے گرتے ہوئے حوصلوں
کو استوار کیا۔
پوری صاحب نے یہاں اہل قوم اور اہل ملک کی خدمت
سرانجام دے رہے ہیں۔ وہاں انہوں نے ادب کی خدمت
میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ انہوں نے کئی ادبی افسانے
لکھے جن میں "بھیگے بادل" "درد کی لہر"۔ خدائی معجزے" اور
دوسری کہانیاں قابل تعریف ہیں۔ انہوں نے وہاں عشق گفرت
افسانے لکھنے سے ہمیشہ ہی اجتناب کیا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے

ہیں وہ حقائق اور اصلیت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں
تو غلط نہ ہوگا کہ وہ بذات خود سرتا پا ایک افسانہ ہیں، ایک
ناول ہیں جسے پڑھنے سے ان کے مد وجزر کا بخوبی پتہ لگ سکتا ہے
جن کی گہرائیوں میں ڈبکی لگانے کے بعد کوئی موتیوں سے دامن کو
سمندر کی سطح سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔
ان کے کئی افسانے روزانہ "سپیج" جموں میں چھپ چکے ہیں۔ پونچھ
زمین کو فخر حاصل ہے کہ پوری صاحب جیسے افسانہ نگار کو
جنم دیا ہے۔ اسی دھرتی نے کرشن چندر جیسی عظیم شخصیت
کو بھی جنم دیا تھا۔

سنسار چند گپتا

مدرس وہ ہے جو بچوں کو علمی لڑ سے بھر دے
جو سینہ کو تموز شعلہ ہائے طور سے بھر دے
طبیعت کو جو ذوق سعی ناشکور سے بھر دے
دلوں کو جو زموز ظاہر و مستور سے بھر دے
جو راز ہستی بے بود کی تفسیر بتلائے
جو خواب زندگی کی بے خطا تعبیر بتلائے

ایسے ہی ایک عظیم اردو کے استاد سنسار چند گپتا صاحب ہیں ان کا جنم جون سنہ 1922ء میں ادھمپور میں ہوا۔ ان کے والد صاحب اسکول ٹیچر تھے۔ ان کی ذات بابرکات سے ان کے دل میں اردو زبان وادب کا شوق پیدا ہوا۔

سنسار چند گپتا صاحب کی اسکول کی زندگی کا باقاعدہ آغاز ادھمپور سے ہوتا ہے۔ انہوں نے 1946ء میں لاہور سے ادیب عالم درجہ اوّل میں پاس کیا۔ 1947ء میں انٹر انگلش میں پاس کرلیا۔ 1948ء میں بطور اردو مدرس تقرر ہوا۔

1950ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ 1952ء میں بی۔ اے کرلیا۔ 1954ء میں بی۔ ٹی کرلی۔

1957ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کرلیا

اور پھر عارضی اُردو لیکچرار بھدرواہ میں تقرر ہوا۔ 1959ء میں
جموں وکشمیر یونیورسٹی سے منشی فاضل پاس کیا اور اوّل رہے
1961ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے پرشین (فارسی)
کیا اور یونیورسٹی میں دوسرا مقام حاصل کیا۔ 1977ء میں
اودھمپور ڈگری کالج میں بحیثیت اردو پروفیسر ملازمت سے
سبکدوش ہو گئے۔

تعلیمی حلقوں میں گپتا صاحب بہت مقبول ہیں۔ اردو فارسی
کے ایک اچھے استاد مانے جاتے ہیں۔ گو ان کی کوئی مستقل
ادبی تصنیف موجود نہیں ہے لیکن انھیں اُردو زبان وادب
سے بہت رغبت رہی ہے۔

گپتا صاحب اپنے طلبا سے بڑی شفقت سے پیش آتے
ہیں۔ اگر طالب علم ہونہار ہو تو اُس کی ممکنہ ہمت افزائی بھی
کرتے۔ انہوں نے طلبہ کے نظریات اور نصب العین سے سروکار نہیں
رکھا۔ وہ شاگردوں کے صرف ذوق وشوق کو دیکھتے ہیں۔
دوسروں کو نقصان پہنچانا وہ اپنی توہین تصوّر کرتے ہیں
یہاں تک کہ جن لوگوں سے وہ ناراض رہے اور جن کو وہ نقصان
بھی پہنچا سکتے تھے انہوں نے نقصان نہیں پہنچایا۔

ایک ورکشاپ میں (سرینگر) ان کے ساتھ کام کرنے کا
افسر ملا تو وہ ایک دلیل دیتے اور پھر خود ہی اسی کو رد کر
دیتے۔ غرضنا ایک ہی مضمون میں ان کے ہاں یہ سلسلہ بار بار
ملتا ہے اور اسی طول طویل عبارت میں چند فقرے ایسے تراش

دیتے کہ ہم سب ساری عبارت پر عش عش کرنے لگتے۔

وہ اپنی تحریروں میں الفاظ و ترکیب کا استعمال کچھ ایسے غیر متوقع طور پر کرتے ہیں کہ قاری چونک جاتا ہے۔

وہ اپنے دکھ درد کا اظہار اوروں پر نہیں کرتے وہ دوسروں کے غم میں برابر کے شریک ہونا چاہتے ہیں۔ گپتا صاحب خاموش طبیعت انسان ہیں اگر کوئی بات ان کے مزاج کے مطابق نہ ہو تو وہ کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتے خاموش رہتے ہیں میری نظر میں پروفیسر ستنار چند گپتا ایک ادبی غایت بھی ہیں اور ایک تاثر بھی اور ایک ادیب بالفوذ بھی گپتا صاحب اردو ادب میں کسی شخصیت کا نہیں ایک روایت کا نام بن چکے ہیں۔

گپتا صاحب قصبہ ادھمپور کو وطن مانتے ہیں حالانکہ وطن کا تصور بڑی وسعت رکھتا ہے۔ شاید وہ اسلئے ادھمپور کو وطن مانتے ہیں" یہ ادھمپور ہے جس سے مجھے زیور سے آراستہ کیا، جس نے مجھے شعور عطا کیا کہ میں حسن، صداقت، ذطانت اور فہم و ادراک کی حقیقت تک پہنچوں جس نے مجھکو تحریر و تصنیف کی تحریک دی۔

پروفیسر ستنار چند گپتا بحیثیت ادیب خواہ کچھ ہوں لیکن بحیثیت انسان اور دوست اعلا (اعلیٰ) اقدار کے حامل ہیں جدوجہد کرنے کی صلاحیت۔ قابلیت محنت اور اپنے اسی تعاون کے جذبہ کی وجہ سے آج شہرت کی بلندی پر ہیں۔

مالک رام آنند

اس افسانہ نگار اور ناول نگار کے ادبی نام اور خاندانی نام میں کوئی تفاوت نہیں ہے، بالکل اس طرح جس طرح ان کے قول و فعل میں فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اگر مالک رام صاحب کے ساتھ آنند نہ ہوتا تو عالمگیر شہرت کے مالک مشہور و معروف محقق مالک رام (دہلوی) کا دھوکہ ہو سکتا تھا مگر کسی کو دھوکہ دینا چونکہ آنند صاحب کی فطرت کے منافی ہے۔ اس لئے انہوں نے آنند کو مالک رام سے الگ نہیں کیا اور وہ مالک رام کے نام سے کم اور آنند کے نام سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔

بہر حال آنند صاحب مئی سنہ 1938ء کو پونچھ کے ایک گاؤں ہیڑہ میں عالم وجود میں آئے۔ یہ گاؤں [illegible] پاکستان کے قبضے میں ہے۔ سنہ 1947ء میں پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر کے جب یہ گاؤں اپنے قبضہ میں لے لیا۔ تو ان کے والدین کو ہجرت کر کے جموں آنا پڑا۔ جموں میں انھیں اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میٹرک پاس کر کے انھوں نے ملازمت اختیار کر لی اور ابھی تک یہ ملازمت میں ہی ہیں۔

پونچھ کی سرزمین نے جہاں اور بھی کتنے ہی نامور اہل قلم پیدا کئے ہیں۔ اسی طرح مالک رام آنند صاحب نے بھی پونچھ کی دھرتی کا حق ادا کیا ہے۔ انہوں نے 1966ء سے باقاعدہ

لکھنا شروع کیا۔ وہ مختلف ادبی تنظیموں مثلاً انجمن ادب، بزمِ فروغِ اردو اور حلقۂ فکر و فن سے وابستہ رہے اور ان انجمنوں میں کلیدی عہدوں پر کام کرتے رہے اور اپنے اپنے افسانوں اور ناولوں پر داد پاتے رہے۔ جلد ہی ان کی ادبی کاوشوں کو ریڈیو کشمیر جموں نے نشر کرنا شروع کر دیا اور انہوں نے سنہ ۱۹۵۵ء میں "منشی" کے عنوان سے اپنا پہلا افسانہ ریڈیو کشمیر جموں سے پڑھا۔ لیکن جہاں تک ان کے کسی اچھے پرچے میں چھپنے کا تعلق ہے سنہ ۱۹۵۶ء میں ان کا افسانہ "دو انسان ایک شیطان" کتاب لکھنؤ میں شائع ہوا۔ لیکن اس سے پیشتر ہی کلدیپ بک سینٹر پکا ڈنگہ جموں اُن کا پہلا ناول "دہکتے پھول، شبنم آنکھیں" شائع کر چکے ہیں۔ یہ ناول کافی مقبول ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۵۷ء میں ان کا دوسرا ناول "اپنے وطن میں اجنبی" شائع ہوا۔ پھر تیسرا ناول "نئے ان پرانے سال" سنہ ۱۹۵۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پھر اس کے بعد ان کا ایک افسانوی مجموعہ "جانے وہ کیسے لوگ تھے" سنہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اب ان کا ایک افسانوی مجموعہ "شہر کی خوشبو" طباعت کی منزلیں طے کر رہا ہے اور ایک ناول "میں اس جا سکتا ہوں" تکمیل کی جانب رواں دواں ہے اور جہاں تک ان کے ادبی جریدوں میں شائع ہونے کا تعلق ہے وہ شاعر بمبئی، تعمیر سرینگر اور شیرازہ سرینگر میں چھپتے رہے ہیں۔

افسانہ اور ناول کے علاوہ یہ حضرت شاعری بھی کرتے ہیں مگر
آج تک انھوں نے بطور شاعر خود کو منوانے کی کوشش نہیں کی
بہر حال بطور افسانہ نگار و ناول نگار انہوں نے بہت مقبولیت
حاصل کرلی ہے۔ اور جہاں تک ان کی زندگی کے دوسرے
پہلوؤں کا تعلق ہے بہت زخم کھائے ہیں دوسروں سے
کیونکہ دوسروں اور خاص کر کچھ دوستوں کی بہت امداد کی ہے
لیکن بدلے میں انھیں بے وفائی کے سوا شاید کچھ بھی نہیں
ملا۔ اس لئے یہ حضرت کبھی کبھی اس دنیا سے بیدل ہو جاتے
ہیں، جس کا پر تو ان کی تحریروں میں جھلک اٹھتا ہے جیسے
یہ صاحب الفاظ کے بھنور میں چھپانے کی کوشش تو ضرور
کرتے ہیں لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں انھیں
پڑھنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ وہ شہاب ثاقب
ہے جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتا ہے مگر خود رہزنوں کی
زد میں آ کر کے راہ بھی ہو جاتا ہے اور دوسروں کو روشنی
دکھاتے ہوئے کبھی کبھی خود اندھیروں کا شکار ہو جاتا ہے،
لیکن وہ ہمیشہ اندھیروں میں نہیں رہتا لمحات کا کھیل اسے
پھر روشنی میں لے آتا ہے۔

ایس۔ این۔ ڈوگرہ

انسان کو خوشیاں حاصل ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں
طرف پھیلی ہوئی اِن خوشیوں کے درمیان خود کو تنہا محسوس کرتا
ہے جب شام کی شفق کو دیکھتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے
اُسے پیشانی پر سجا لوں۔ حسن کا سمندر اُن کے چاروں
طرف موجزن ہو اور وہ پیاسا رہے۔
جانی پورہ جس کا اصلی نام جانکی پورہ ہے کے ایک خوددار
گھرانے میں ایس۔ این۔ ڈوگرہ کا جنم ہوا۔ بقول ڈوگرہ صاحب
اپنی صحیح تاریخ پیدائش مجھے معلوم نہیں۔ بس میرا ایجوکیشن
ریکارڈ جو کچھ کہتا ہے اُس پر یقین کر رہا ہوں یعنی سرکاری اندرا
جات کے مطابق زندگی کی ۵۰ ویں منزل طے کر رہا ہوں۔
اپنے عشق کے بارے میں لکھتے ہیں "کبھی کبھی تو کوئی آرزو اتنی مہنگی
پڑتی ہے کہ خرید کر بِک جاتے ہیں میری کلپنا بھی ایسی ہی ابھاگن
نکلی اور جس لڑکی سے میں پیار کرتا تھا۔ اسکول کے باہر جس کی
ایک جھلک کی خاطر میں گھنٹوں انتظار کرتا تھا۔ جو میرے دل کی
دھڑکن بن چکی تھی۔ جس پر میں جان چھڑکتا تھا۔ جس نے مجھے
ایک ساتھ جینے اور مرنے کے عہد و پیماں کئے تھے، وفا کی قسمیں
کھائیں تھیں جو میرے سینے سے لپٹ کر مجھ میں سما جانا چاہتی تھی
اور جس کے آنسوؤں سے میرا گریباں بھیگ جاتا تھا۔ چنانچہ جب

سو کی گدی آئی تو اس نے انتخاب کا ہار کسی دوسرے گلے میں ڈال دیا۔ میرے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا اور سینے میں دل ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا.......... دل پر ثبت محبت کا نقش مٹانا سہل نہیں تھا۔

زندگی کی خوشیاں تنہائی کی مسکراہٹ، بے بسی کا احساس شام کی شفق اور حسن کی پیاس کو اپنی کہانیوں میں سمو کر تسکین فراہم کرنا انھوں نے شوق بچپن اور لڑکپن ان گلیوں، اودھمپور اور کٹھوعہ کے اضلاع میں گزارا۔ وہاں کے دیہات اور قصبوں کی زندگی میں جاگیردارانہ نظام کی ایسی گھٹن دیکھی تھی جس سے ان کا ذہن بچپن ہی سے راہ فرار تلاش کرنے لگا۔

ڈوگرہ صاحب ایک کہانی کار، ادیب، صحافی، سماجی اور سیاسی لیڈر کے روپ میں لوگوں اور زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ڈوگرہ صاحب کی کتاب "مہاشہ جاتی کی تاریخ" پر پروفیسر اجیت کشی نے لکھا کہ "مہاشہ جاتی کی تاریخ کے مصنف جناب ایس۔ اینا۔ ڈوگرہ ایک باشعور لیڈر، ایک ذمہ دار صحافی اور خوش گو ادیب ہی نہیں بلکہ ایک انسان دوست اور دردمند انسان بھی ہیں۔"

اس میں کوئی شک کی بات ہی نہیں کہ ڈوگرہ صاحب با اخلاق اور با مروت انسان ہیں۔ "گھاٹی کی گونج" ان کا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے شعوریت کی یادداشتوں کو محفوظ کیا ہے

ڈوگرہ صاحب نہ صرف ادیب ہی ہیں بلکہ اپنا اخبار "لیڈر" کے ذریعے انھوں نے ادبی ثقافتی، سیاسی اور سماجی انقلاب کی بنیاد بھی رکھی۔ ان کا یہ اخبار سنہ ۱۹۷۰ء سے عوام اور زبان اُردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

بقول ان کے "انقلاب" زندگی کے صرف ایک شعبے میں نہیں آتا بلکہ وہ زندگی سیاست، ادب، صحافت، کلچر زبان اور معاشیات کے مختلف پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

۱۹۷۵ء میں انھوں نے بے گھر لوگوں کو گھر دلانے کے سلسلے میں جیل یاترا بھی کی۔ ان کی قربانی رنگ لائی اور نتیجہ کے طور پر جانی پورہ ہاؤسنگ کالونی کا وجود عمل میں آیا۔

۱۹۷۷ء میں ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے حلقہ جنوبی سے قانون ساز اسمبلی کا الیکشن لڑا۔

اُن کا اخبار "لیڈر" ایک اخبار سے زیادہ ایک مشن ہے جو حق گوئی، دبیا کی. ہندو مسلم ایکتا کے پرچار، فرقہ داریت کی مخالفت اور اردو کی بے لوث خدمت میں منہمک رہا ہے۔

ڈوگرہ صاحب نے اپنی ادبی صحافتی سماجی اور سیاسی زندگی میں سچائی، نڈرتا، بیباکی اور ایمانداری کی راہ اختیار کی ہوئی ہے جس کی وجہ سے عوام میں وہ ہر دلعزیز ہیں۔

جہاں تک ان کی ادبی تحقیقات کا تعلق ہے وہ حسب ذیل ہیں

۱۔ رامائن نمبر (خصوصی شمارہ)

2۔ گورو رویداس نمبر (۱۰۵ ویں اور ۶02 ویں جنم شتابدی پر)

3۔ مہاشہ جاتی کی تاریخ

4۔ شخصیت نمبر (شری جگموہن لال)

5۔ ڈاکٹر امبیڈکر

اس کے علاوہ بھی متعدد نمبر اور ادبی تصنیفات ان کے ہاتھوں سے نکل کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

کیول پنڈت

ان کا جنم ۳ جولائی ۱۹۳۲ء کو جموں میں ایک براہمن خاندان میں ہوا۔ ان کے آباؤ اجداد کوٹ بھلوال کے قریبی گاؤں کھنک میں مکین تھے۔ لیکن جب چھوٹی عمر میں ان کے دادا جان اور دادی جان والد صاحب کو داغ مفارقت دے گئے تو ان کے والد صاحب نے بھی بہتر سمجھا کہ رشتہ داروں کی طعن و تشنیع اور انگشت نمائی سے بچنے کے لئے شہر ہی چلا جائے۔ ان کے قریبی رشتہ دار تو کوئی تھا نہیں۔ جو تھے انہوں نے چھوٹے لڑکے کو اپنے سے دور رکھنے میں ہی مصلحت سمجھی

اُن کے والد صاحب کی بہن جو کٹڑہ کے قریب نلچے گاؤں میں رہتی تھی انہوں نے بھی ان کے والد کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور انہوں نے اپنی محنت، اور لگن سے ایک بڑا ٹھیکیدار اور ٹرانسپورٹر بن کر دکھا دیا۔ گو کیول پنڈت کے والد کسی یونیورسٹی یا کالج سے ڈگری یافتہ تو نہ تھے مگر اُردو اتنی روانی سے پڑھ لکھ اور بول سکتے تھے کہ بڑے سے بڑا نقاد، اُردو داں بھی چند تعریفی جملے کہے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔

کسی زمانے میں ان کے رشتہ دار جو پنڈت صاحب کے والد کو دبال جان سمجھتے تھے اب دولت اور شہرت دیکھ کر ان کے ارد گرد منڈلانے لگے۔ ان کے والد اتنے معصوم تھے کہ انہوں نے

والد صاحب رشتہ داروں کی ناز برداریاں اُٹھاتے رہتے اور گھر میں آئے دن کہا سُنی اور افراتفری بھرے ماحول سے جب کیول پنڈت تو آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرتے تھے۔

ان مناظر کو دیکھ کر ان کے دل و دماغ میں یہی خیال ایک بجلی کے کوندے کی طرح چمکتا اور پھر جوار بھاٹہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ پڑھائی میں ان کا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ اسکول جاتے، اسکول سے آتے، اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت یہی خیال ان کا پیچھا کرتا۔ گھر والوں نے انھیں ڈاکٹر کو دکھایا۔ مگر ڈاکٹر کی دوائی کا اثر بھی بے سود تھا اور یہ دن بدن دُبلے ہوتے جا رہے تھے۔ اگر ان کی ماں پوچھتی کہ اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو تو یہ صاحب کیا بتاتے..........

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کا دن وہ بھول نہیں سکتے۔ جب انہوں نے پانچ چھ سو کے قریب انسانوں کو خون میں لت پت تڑپتے، روتے اور بلکتے ہوئے دیکھا۔ جن میں کچھ مرد تھے، کچھ بچے تھے، کچھ عورتیں تھیں اور کچھ ان چھوئی کلیاں...... جنھیں کپڑوں سے بے نیاز۔ ننگ دھڑنگ مٹی پر پھینک دیا گیا تھا۔ تاکہ ہر آنے جانے والوں کے ننگے جسموں کو دیکھ سکے۔ اس وحشی اور گھناؤنے ماحول کو دیکھ کر انھیں پری اور شہزادے کی بجائے بھوتوں اور پریتوں کی کہانیاں یاد آنے لگتیں۔ جو بے گناہ پریوں کو اغوا کرتے جاتے تھے اور پھر قتل کر

ڈالتے تھے۔ ایسی کہانیاں انھیں اکثر ان کی لوا سناتی تھیں۔
کچھ ہی وقت کے بعد انھوں نے چاندنی میں ایک گلفام
پری کو اپنے گھر کی سامنے والی چھت سے گھورتے ہوئے دیکھا۔
پھر یہ دونوں آپس میں ملتے رہے اور پھر یہ ملن کی شادی کے روپ
میں بدل گیا یعنی کیول پنڈت اور اُس گلفام پری کا ملن ہو گیا
بچپن سے جو مجر ویاں ان کے دل ودماغ میں بھری تھی اسے
انھوں نے کہانیوں ڈراموں کی شکل میں کاغذ پر بکھیرنا شروع
کیا اور وہ لکھنے لگے۔
1952ء میں ان کی کہانیاں اخبار "چاند" میں چھپیں۔
جنہیں بہت سراہا گیا۔ جن میں "امید" "سائے" "رام داسی"
ایک کلرک "لہریں اور طوفان" "لنگی لڑکیاں" استاد دھرما کی
سراہا نر سنگھ داس نرگس جیسے عظیم صحافی نے کی۔ نہ صرف جموں
کی اخبارات نے بلکہ ہندوستان کی کثیر الاشاعت اردو اخبارات
ورسائل "ملاپ" "پرتاپ" "ہند سماچار، نرالی دنیا، چندن،
سویرا۔ شاعر۔ نئی صدی نے بھی ان کی نہ صرف حوصلہ افزائی
کی بلکہ ان کی تعریفوں کے پل بھی باندھے۔
1967ء میں ان کا پہلا ناول "پرچھائیں" اشاعت
کی منزل عبور کر کے سامنے آیا تو لوگوں نے اُسے ہاتھوں
ہاتھ لیا۔
نہ صرف اخبارات، ورسائل نے ہی ان کی قدر وقیمت
ڈالی بلکہ ریڈیو کشمیر جموں نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی۔

ریڈیو سے اُنہوں نے اپنے افسانے، مضامین، ڈرامے نہ پڑھ سکنے والے لوگوں تک بھی پہنچا ئے۔ کچھ سالوں تک اُنہوں نے ادب کی خدمت کرنا چھوڑ دیا مگر کشی کاشمیری۔ ہرش سبھائی، سو نیلا پنڈت جیسی عظیم فن کاروں نے ان کو پھر اردو ادب کی خدمت کرنے کے لیے لگا دیا۔ جس کو وہ اب تن دہی سے سر انجام دے رہے ہیں۔

اہل اردو کو امید ہے کہ ان قلم سے جلد ہی نئے افسانے یا ڈرامے یا ناول منظر عام پر آئے۔

—— X ——

ماسٹر روشن لال

روزانہ "سیچ" کے مدیر روشن لال کا صحافت میں کافی اچھا مقام ہے کہا جاتا ہے کہ آپ "سیچ" کا جھنڈا بلند رکھنے کیلئے اکثر جھوٹ سے برسر آزمار ہے اور دنیا سے "سیچ" کو منواتے رہے۔

ماسٹر روشن لال تحصیل میرپور کے علاقہ گھڑی کے سموال گاؤں میں 12 بھادوں سنہ 1970ء بکرمی میں ایک مہاجن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم انھوں نے اپنے گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔ ان کے گاؤں کو فخر حاصل ہے کہ "سیف الملوک" نامی مشہور کتاب کے خالق میاں محمد صاحب نے سموال کی مسجد میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسلئے "سیف الملوک" کی مناسبت سے ماسٹر روشن لال کا گاؤں بھی کافی مشہور و معروف ہے۔ ماسٹر جی نے سنہ 1989ء بکرمی میں میٹرک پاس کی اور سنہ 1942ء میں شریمتی وید رانی سے شادی کی انھوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور فریڈم فائیٹر کے طور پر کافی شہرت حاصل کی۔ شاید جنگ آزادی میں مصروف رہنے کی وجہ سے ہی انھوں نے ملازمت اختیار نہیں کی، ذریعہ معاش کے لئے چونکہ پرائیویٹ ٹیوشن کیا کرتے تھے، اسلئے انھیں ماسٹر کہنے لگے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں میرپور سے ہی راجہ محمد اکبر خاں مرحوم نے ہفت روزہ "سیج" جاری کیا تو ماسٹر جی نے اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی راجہ محمد اکبر خاں مرحوم کے تحریر کردہ اداریوں کا ایک ایک لفظ بڑا قیمتی اور مبنی بر حقیقت ہوتا تھا جب راجہ محمد اکبر خاں ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء میں وفات پا گئے تو ان کے ورثاء نے "سیج" کی ادارت ماسٹر جی کو سونپ دی۔ پاکستانی حملہ کی وجہ سے جب ماسٹر جی میرپور سے ہجرت کر کے جموں آگئے تو "سیج" جموں سے نکلنا شروع ہو گیا۔

سنہ 1953ء میں شیخ محمد عبداللہ جب اقتدار سے الگ کر دیئے گئے تو "سیج" ہی وہ اخبار تھا جس نے شیخ صاحب کی حمایت کی تھی اور جس کی پاداش میں ماسٹر روشن لال کو دو مرتبہ جیل یاترا کرنی پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے اخبار بہت مقبول ہو گیا، خاص طور پر وادی کشمیر میں روزانہ ساڑھے تین ہزار اخبار جاتا رہا ہے۔

ماسٹر روشن لال نیشنل کانفرنس کے سرگرم کارکن رہے سنہ 1981ء سے یہ لیجسلیٹو کونسل کے نامزد ممبر چلے آرہے ہیں۔ بطور اخبار نویس اور عوامی لیڈر انہوں نے کونسل میں غریب اور بے کس عوام کی ہمیشہ نمائندگی کی ہے اور ان کے مفاد کی حفاظت کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ وہ آئندہ بھی عوام کی خدمت میں سرگرم عمل رہیں گے۔

ماسٹر روشن لال کے لکھے ہوئے اداریے عوام میں بہت مقبول اور بصیرت افروز ہوئے ہیں۔ انھیں پڑھ کر سبھی لوگ جھوم جھوم جاتے ہیں اور ماسٹر روشن لال کی قلم کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

موہن باور

ایک مشہور افسانہ نگار اور کامیاب صحافی ہیں۔ جموں میں 7 دسمبر 1927ء کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ گذشتہ بیالیس برس سے افسانے لکھ رہے ہیں ان کی پہلی کہانی جس کا عنوان "گلی" تھا 1942ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے افسانے ملک بھر کے ادبی رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ جہاں تک ان کی تصنیفات کا تعلق ہے۔ گیارہ کے قریب ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک کتاب "توی اور جہلم" میں انھوں نے ریاست کے ادیبوں کے شہ پاروں کو ترتیب دیا ہے۔ ان کی دیگر کتابوں کے نام ہیں

"وہسکی کی بوتل" "تیسری آنکھ" "دوسرا کنارا" "سیاہ تاج محل" "بچوں کی محفل" "بچوں کی دنیا" "بچوں کے کھیل" "پتھروں کا شہر" ناولٹ۔ اور "لمحہ لمحہ زندگی"۔

ان کے افسانوی مجموعے "سیاہ تاج محل" پر جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے انھیں پہلے انعام سے نوازا تھا۔

افسانوں کے علاوہ یہ ریڈیو فیچر اور ریڈیو ڈرامے بھی لکھتے رہے ہیں جو ریڈیو پر نشر ہو کر عوام سے داد پاتے رہے ہیں۔

بقول ان کے کئی برسوں سے یہ ایک افسانوی مجموعے "اپنا گھر" کو ترتیب دے رہے ہیں مگر تا حال انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہو رہیں۔

کچھ عرصہ پہلے یہ ایک ادبی ماہنامہ "سنگم" جموں سے شائع کرتے رہے ہیں۔ یہ بہت ہی خوبصورت ماہنامہ تھا جو کسمپرسی کی حالت میں بند ہو گیا۔

موہن یاور نے ادبی میدان کے علاوہ فلمی میدان میں بھی قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ایک فلم "پھر بہار آئی" بننے جا رہی تھی۔ اس فلم کے فلمساز تھے سدرشن کمار اور وجے مہاجن۔ انھوں نے اس فلم کے مکالمے لکھے تھے مگر نہ جانے کیوں اس فلم کی شوٹنگ ہی نہ ہو سکی۔

آج کل یاور صاحب ایک فلمی سکرپٹ "اپنا گھر" پر کام کر رہے ہیں۔ اور ایک روزنامہ "رفتار" کامیابی سے چلا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔!

کے۔ ڈی۔ سنگھ

ایک فری لانس (freelance) اور پبلشر
تحصیل بھدرواہ کے رونگہ نامی گاؤں کے ایک متوسط
گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کچھ گھریلو الجھنوں کی وجہ سے انکا
بچپن پریشانیوں میں گزرا، پھر بڑے ہوئے تو میونسپلٹی
میں مستقل ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں انھیں کچھ باذوق
ادب نواز دوست اور ادبا، مل گئے۔ جنہوں نے انھیں بادہ
وساغر سے متعارف کروایا یہاں انھیں لکھنے کا شوق پیدا
ہوا۔ ابتدا افسانے سے ہوئی۔ جو شائع بھی ہوا جو حوصلہ
افزائی نے ناول نویسی کی طرف مائل کیا اور ایک چھوٹا
سا ناول "ڈاکٹر سنگھ" ویرلیشور بلوریہ کے نام سے لکھ
دیا۔ جسے ان کے دوستوں نے اپنی گرہ سے خرچ کر کے شائع
کر دیا۔ ناول کافی مقبول ہوا اور ٹھاکر پونچھی نے بی۔ ایڈ
کالج میں مختصر سا تعارفی مقالہ بھی پڑھا۔

پھر یہ اپنے آبائی گاؤں بھدرواہ چلے گئے اور شادی
کر لی۔ وہاں محکمہ جنگلات میں ٹھیکیداری شروع کر دی۔
1981ء میں انھوں نے چند مظلوم ٹھیکیداروں کی ایسوسی
ایشن بنائی جو حق تلفیوں کے خلاف نبرد آزما ہوئی
اس دوران دو بچوں کے باپ بھی بن گئے۔ ایک لڑکا

اور ایک لڑکی پھر ٹھیکیداری چھوڑ کر جموں آ گئے۔ آجکل ڈسٹرکٹ کورٹس جموں میں دو تین گھنٹے ٹائپ کا کام کرتے ہیں۔ بعد ازاں اخبارات کے لئے خبریں لکھتے ہیں اور اپنی ایک ذاتی ایجنسی بھی قائم کر لی ہے۔ دس بارہ اخبارات کو روزانہ خبریں پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ طنزیہ اور سیاسی مضامین لکھتے ہیں۔ ریڈیو پر افسانے بھی پڑھتے ہیں۔ اپنی حق تلفی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

زمانے کی استحصال پسندی سے نالاں بھی ہیں، مایوس بھی ہیں۔ بے چین بھی ہیں۔ شاید انھیں حالات کو لے کر "علی بابا چالیس چور" کی روائتی کہانی کے انداز میں کچھ وزراء اور ان کے حاشیوں سے متعلق ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ بقول ان کے یہ صاحب انقلابی ہیں اور قسمت میں یقین نہیں رکھتے لیکن قدرت پر یقین رکھتے ہیں۔ رشوت خوری، بے ایمانی کے خلاف لڑتے رہے ہیں اور اب بھی لڑ رہے ہیں۔ جس کے لئے انھیں قتل کی دھمکیاں بھی ملتی ہیں۔ لیکن یہ اپنی خود اعتمادی کے طفیل مشکل ترین حالات کا مقابلہ بھی کر چکے ہیں۔

جتندر شرما

جتندر شرما 17 مارچ 1931ء کو سندروں کے عظیم شہر جموں میں پیدا ہوئے۔ 1945ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا، 1956ء میں ادیب فاضل اور 1957ء میں بی اے اور 1959ء میں پربھاکر جموں وکشمیر یونیورسٹی سے پاس کیا۔ بعد ازاں ایم۔ اے اردو (فرسٹ کلاس فرسٹ) 1968ء میں جموں یونیورسٹی سے پاس کیا۔

1948ء میں شرما صاحب نے جموں میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہو جانے پر وہاں ملازمت اختیار کر لی اور بطور سٹاف آرٹسٹ دیہاتی پروگرام میں کام کرنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں اردو کے نامی افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے انہوں نے بڑی لگن اور محنت سے اسٹیشن کے پروگراموں کو سنوارنا شروع کیا۔

انھیں دنوں ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے پہلا ڈرامہ "رستم وسہراب" کھیلا گیا جس میں بیدی صاحب نے رستم کا کردار ادا کیا جبکہ سہراب کا کردار ادا کیا۔ جبکہ سہراب کا کردار جتندر شرما صاحب نے کیا۔ ڈرامہ کے

آخری المناک منظر کے موقعہ پر شرما صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سوتا پھوٹ پڑا اور بیدی صاحب کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس کے بعد شرما صاحب کو ڈرامہ سیکشن کا کام سونپ دیا گیا۔

سول سروس کی ریڈیو کی ملازمت کے دوران انھوں نے بے شمار ڈراموں میں کام کیا اور خود کوئی چار ایک درجن چھوٹے بڑے ڈرامے تصنیف بھی کئے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ شرما صاحب کسی ڈرامے کا مسودہ سنبھال کر نہیں رکھ سکے۔ علاوہ ڈراموں کے انہوں نے طنز و مزاح کی بہت سی مسلسل بات چیت نشر کیں جن میں:

1۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔
2۔ ظالم بیوی کے تازیانے۔
3۔ بے مزہ ہوتی ہماری زندگی، اگر پاگل خانے بند ہوتے
4۔ ہمیں تو اس ادا نے مار ڈالا، ہمیں چلی جائیں گے۔
5۔ پہلے پہل جب لاٹری کا ٹکٹ خریدا۔ کافی مشہور رہیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو کشمیر جموں سے بہت سی تقاریر نشر کیں جن میں

1۔ بینڈ باجے والا
2۔ چرچے لاٹری تک
3۔ شیر سنگھ بنام بھجن رام
4۔ ماڈرن لیلیٰ مجنوں
5۔ اف زبان ہی یا کرنی
6۔ ہائے رے فیشن
7۔ گلے میں نوٹوں کے ہار
8۔ جیون ساتھی
9۔ ہتھیلی پہ سرسوں جانا

وغیرہ

ان کا ارادہ سب کو ایک کتاب کی شکل دینے کا تھا اور اسی مقصد
کے لئے انہوں نے ان کی دو نقول کلچرل اکادمی جموں کے دفتر
میں سبسڈی کے لئے دے دیں لیکن اتفاق کہیے یا اردو سے
محبت کرنے والوں کی بدنصیبی کہ یہ دونوں نقول ضائع ہوگئیں
جس کا ماتم شرما صاحب کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

شعر

وہی میری کم نصیبی ، وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا ، یہ کمالِ نے نوازی

یہ تو شرما صاحب کی زندگی کا ایک دور ہے جبکہ وہ
ریڈیو کشمیر جموں سے متعلق تھے، دوسرا دور اس وقت
شروع ہوتا ہے جب آپ نے کلچرل اکادمی میں کلچر آفیسر
کی اسامی کے لئے درخواست پیش کی اور چن لیے گئے۔
سنہ 1964ء میں کلچرل آفیسر چن لیے جانے کے دو برس بعد
ڈپٹی سیکریٹری اور بعد ازاں ایڈیشنل سیکریٹری بنا دیئے
گئے اور 31 مارچ سنہ 1986ء کو باعزت ریٹائر ہوگئے۔
ریڈیو اور کلچرل اکادمی کی ملازمت کے دوران ادب
کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ شرما صاحب نے ایک
ڈوگری فلم "گلاں ہوئیاں بتیاں" میں بطور تہیہ وار ادا
کاری سے جوہر بھی دکھائے تھا۔ گو وہ فلم باکس آفس پر
بُری طرح پٹ گئی تھی لیکن شرما صاحب کی اداکارانہ
صلاحیتوں کا فلم بینوں سے اعتراف تو کروا ہی چکے ہیں۔

قلم کے ساتھ شرما صاحب علمی میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے وہ تقریباً دس برس سے جموں یونیورسٹی کے زبانوں سے متعلق بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر چلے آ رہے ہیں۔

جیوتیشور پتھک

ناولسٹ، ڈراماٹسٹ اور شاعر جیوتیشور پتھک اسوقت محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ 8 راکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء کو یہ جموں میں پیدا ہوئے۔ اِن کا خاندانی نام جنہیں یہ اصل نام کہتے ہیں جیوتی پرکاش گندوترہ ہے۔

تعلیمی لحاظ سے یہ ایم۔ اے (انگریزی) اور آنرز ان اُردو (ادیب فاضل) کی ڈگریاں لیے ہوئے ہیں۔

انھوں نے نوکری کا آغاز ۱۹۶۲ء میں بطور ایک اُردو مدرس کیا تھا۔ اور پھر اِس ملازمت کو چھوڑ کر ۱۹۶۸ء میں محکمہ اطلاعات میں آ گئے اور ترقی کر کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر جا پہنچے

جہاں تک ان کے لکھنے کا تعلق ہے ان کے لکھنے کا آغاز سنہ ۱۹۵۷ء میں ایک سندھی ڈرامے "آشا پورتی" سے ہوا جو اُس وقت کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔ لیکن

انھوں نے باقاعدہ ۱۹۶۱ء سے لکھنا شروع کیا اور اس کے تین برس بعد ان کا پہلا افسانہ ۱۹۶۴ء کے شیرازہ (سرینگر) میں شائع ہوا۔

ریڈیو سے ان کا پہلا گیت ۱۹۶۲ء سے نشر ہوا۔

جہاں تک ان کی ادبی تخلیقات کا تعلق ہے یہ چھ کتابوں کے مالک ابھی تک مالک ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ کومل کومل گیت (گیت)
۲۔ ایک ادب ملاحظہ (ڈرامہ)
۳۔ ہجوم (ناول)
۴۔ سڑکیں، پل اور نہریں (ترقیاتی کتابچہ)
۵۔ رُن جھن (ہندی نظمیں)
۶۔ کلچرل ہیریٹیج آف ڈوگراز (انگریزی)

۱۹۶۰ء میں ملازمت اختیار کرنے سے پیشتر یہ صاحب "برکھات" ویکلی پونچھ کے ایڈیٹر اور "سندیش" ہندی کے نیوز ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔

مہیش چندر شرما

مہیش چندر شرما 4 رجولائی سنہ 1940ء کو پنڈت پریم آنند شرما کے ہاں میرپور خاص (واقع مقبوضہ کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ زندگی کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے ایک سرکاری اسکول میں بھرتی ہو گئے۔ پھر ملازمت کے دوران ہی ایم۔ اے (انگریزی) اور بی۔ ایڈ کیا، اور آج وہ انگریزی کے لیکچرر ہیں۔

جہاں تک اُن کے ادبی سفر کا تعلق ہے بقول ان کے کہ ان کی پہلی نظم اور کہانی بارہ سال کی عمر میں لکھی گئی اور ان کا پہلا اسٹیج ڈرامہ تقریباً سولہ برس کی عمر میں لکھا گیا جو سنہ 1958ء میں کھیلا گیا۔ نظمیں و کہانیاں اسکول و کالج میگزینوں میں شائع ہوئیں۔ بعد ازاں اخبارات میں مزید نظمیں گیت اور افسانے شائع ہوئے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "چوراہا" کے عنوان سے سنہ 1984ء میں شائع ہوا۔

جہاں تک ادبی میدان میں کودنے کا تعلق ہے اس کی تحریک انھیں منشی پریم چند، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کی تحریروں سے ملی۔ اسی طرح مرزا غالب علامہ اقبال اور میر تقی میر کے اشعار نے انھیں نظمیں، گیت اور شعر کہنے کی ترغیب دی۔

بقول مہیش شرما انھوں نے شاعری وغیرہ میں باقاعدہ طور پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ لیکن شری جتندر شرما کی صحبت میں آنے پر شعوری اور غیر شعوری طور پر نظم، نثر اور ڈرامہ کے بارے میں بہت کچھ سیکھا اور اسی علم کی بنیاد پر ان کے ادب وفن کی عمارت بلند ہوئی۔

اس سلسلہ میں ان کے والد صاحب کا بھی ان پر کافی اثر ہے کیونکہ وہ بھی ایک نظم گو اور گلوکار تھے۔ موسیقی کی ابتدائی تربیت انھوں نے اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ ان کے بڑے بھائی صاحب بھی شاعر اور نثار کہے جاتے ہیں۔

مہیش شرما کے لگ بھگ ایک درجن ڈرامے ریڈیو کشمیر، جموں اور ملک کے دیگر اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں یہ صاحب ڈرامے لکھنے کے علاوہ ایک سو ریڈیائی ڈراموں میں اداکاری کا جوہر بھی دکھا چکے ہیں اور کلچر اکادمی جموں و کشمیر کی جانب سے دو مرتبہ بہترین اداکاری پر انعام بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ڈراموں کی ہدایتکاری کے فرائض بھی سر انجام دیتے رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ انھیں بچپن سے ہی موسیقی سے لگاؤ رہا ہے اور اس لگاؤ کے طفیل یہ اپنے تحریر کردہ گیتوں کی دھنیں بھی خود ہی بناتے ہیں۔ ان کے ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوتے رہے ہیں ان میں "ناک اور نفری" "سگائی"، "ہنسا ہنس اپنا کا درد"، اور لو "نئے قدم" کافی پسند کئے گئے ہیں۔ ان کی اسٹیج ڈراموں کی کتاب "ساہتی کا اشاعت کے مراحل طے کر رہی ہے۔

ویدپرکاش شوری

ویدپرکاش شوری صاحب کا جنم 2 اپریل 1933ء کو میرپور جو ملک (مقبوضہ کشمیر) میں ہوا جہاں ان کے والد مرحوم لالہ رام داس ٹھیکیدار مال تھے۔ پانچ چھ سال تک ان کی تعلیم اپنی والدہ کی زیرِ نگرانی ہوئی اور اس تعلیم میں اردو لکھنا پڑھنا شامل تھا۔ والدہ چونکہ اردو جانتی تھیں اس لیے ان کو بھی اردو سے لگاؤ ہو گیا۔ سنہ 1945ء میں میرپور سے ہائی سکول نے میٹریکولیشن کا امتحان دیا۔ سنہ 1947ء میں ملک کا بٹوارہ ہوا اور یہ صاحب اپنے والدین اور چھوٹے بھائی وید سوری سے بچھڑ گئے۔ وہاں کچھ لوگوں نے انھیں پناہ دی اور حالات درست ہونے پر انھیں واگھا بارڈر پر آ کر چھوڑ گئے۔ امرتسر میں ان کی ملاقات ان کے والدین سے ہو گئی۔ بھارت آ پہنچ کر انھیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ تاش سے کھیلنے والے دوستوں کی صحبت میں انھیں شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اُن کے دل میں اردو آنرز کا شوق پیدا ہوا۔

سنہ 1953ء میں انھوں نے محکمہ ایکسائز میں ملازمت اختیار کر لی اور ملازمت کے دوران ہی سنہ 1962ء میں ادیب فاضل کا امتحان جموں و کشمیر یونیورسٹی سے پاس

کر لیا بعد ازاں پرائیویٹ طور پر بی۔ اے پاس کر لیا۔ سنہ 1958ء میں انھوں نے شادی کر لی، جس کے نتیجے میں تین لڑکیاں اس جہاں میں آ گئیں۔

پھر ایکسائز ڈیپارٹمنٹ سے ہوتے ہوئے محکمہ صحت اور محکمہ صحت سے ہوتے ہوئے پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف میں چلے گئے لیکن وہاں بھی مستقلاً نہیں رہ سکے، چنانچہ ۱۴ نومبر سنہ ۱۹۵۵ء کو جموں یونیورسٹی میں ان کا تقرر بطور اسسٹنٹ رجسٹرار ہو گیا۔ اور جنوری سنہ 1977ء میں ڈپٹی رجسٹرار بنائے گئے اور تب سے اُس عہدے پر سرفراز چلے آ رہے ہیں۔ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے اردو ایم۔ اے کی سند حاصل کی ہے۔ اب تک وہ ریڈیو کے لیے تو کوئی 25 فرمائشی مضامین لکھ چکے ہیں جن میں "مولانا ابوالکلام آزاد شاعر کی حیثیت سے"، "میدان صحافت کے شہسوار ابوالکلام آزاد"، "اگر آج غالب زندہ ہوتے"، "منٹو کے افسانے"، "فیض کے کلام میں رومانی عنصر"، "اردو شاعری میں وطن پرستی"، "شخصیات کے آئینے میں ڈاکٹر معین الدین قادری زور"، "سجاد حیدر یلدرم"، "لیطرس"، "شوکت تھانوی" اور "نیاز فتح پوری" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

سوری صاحب اب عنقریب اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے ہیں۔

وجے سوری

جناب وجے سوری ۱۴ فروری ۱۹۴۲ء کو مقبوضہ
کشمیر کے ضلع میرپور میں پیدا ہوئے۔ میرپور پر پاکستان
کا قبضہ ہو جانے پر والدین کے ساتھ جموں چلے آئے یہاں
انھیں اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔

اسکول میں مختلف مدارج طے کرتے ہوئے انھوں نے
میٹرک پاس کر لیا۔ میٹرک کے بعد ڈگری میں پردین کا
امتحان بھی پاس کر لیا۔

ان کی والدہ جموں کی اردو جانتی تھیں، اسلئے انھوں
نے اردو سیکھنے میں ان کی بہت مدد کی۔

۱۲ سال کی عمر میں سوری صاحب نے لکھنا شروع
کر دیا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ روزنامہ "اُجالا" جموں میں
۱۹۵8ء میں چھپا۔ بعد ازاں ان کے افسانے ماہنامہ "تخلیق"
"دہلی" ہفت روزہ "چترا" دہلی وغیرہ جموں میں چھپنے
لگے۔ یہ صاحب "تخلیق" کے سب ایڈیٹر بھی رہے اور
روزنامہ "سندیش" جموں اور "اُجالا" جموں اور
"قومی آواز" جموں سے بھی کافی عرصہ منسلک رہے۔
ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "آخری سودا" ۱۹۶۵ء میں
شائع ہوا تھا۔ پھر ایک ناول "ایک ناؤ کاغذ کی"
۱۹۶۷ء میں دوسرا ناول "کانچ اور پتھر" (پاکٹ بک میں)

سنہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔

۱۹۷۰ء سے انھوں نے ریڈیو کے لئے لکھنا شروع کردیا جموں، سرینگر اور بمبئی ریڈیو سے ان کے ڈرامے وافسانے نشر ہوئے۔ ریڈیو ڈراموں میں انھوں نے اداکاری بھی کی 1973ء سے انہوں نے سرینگر ٹیلیویژن کے لئے لکھنا شروع کیا اور ٹی۔ وی ڈراموں میں اداکاری کی۔ ان کے لکھے ہوئے ٹی۔ وی۔ ڈرامے ٹیلی کاسٹ بھی ہوئے۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی سے پانچ مرتبہ اداکاری پر انعام بھی حاصل کیا ہے۔

علاوہ ازیں انھوں نے فلم لائن میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

فلم۔ "اونچی اڑان" میں ولن کا رول کیا اور فلم "بھید بھاؤ" میں نرسنگھ ولن کا کردار نبھایا۔

آج کل یہ ریاست جموں وکشمیر کے سانگ اینڈ ڈرامہ ڈویژن میں کام کر رہے ہیں۔

کیدار ناتھ آملا

کیدار ناتھ آملا کسی معروف ادبی شخصیت کا نام کبھی بھی
نہ ہو لیکن ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب ، اردو صحافت
اور اردو کی تدریس کے میدانوں میں ان کا کردار قابلِ
ستائش رہا ہے۔ کیدار ناتھ آملا ریاست کے سرحدی قصبہ
مظفر آباد کے ایک کھتری گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی
ولادت 2 فروری سنہ 1319ء کو مظفر آباد میں ہوئی تھی۔
سترہ سال کی عمر میں ہی انہوں نے اردو میں لکھنا شروع کر دیا
تھا جبکہ اس وقت نویں درجے کے طالب علم تھے۔ اس زمانے
میں جموں سے ملک گیر شہرت کا ایک اردو ماہنامہ رتن شائع
ہوتا تھا جس میں نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے دلچسپ
مضامین ہوتے تھے۔ اس ماہنامہ میں کیدار ناتھ آملا کی ہلکی پھلکی
تحریریں چھپنے لگیں۔ ایک سال بعد جب انہوں نے دسویں
درجے کے امتحان میں داخلہ لیا تو سارے متحدہ ہندوستان میں
اردو کے فروغ کی ایک منظم اور زور دار مہم شروع ہو چکی
تھی۔ اس مہم کے تحت جگہ جگہ اردو ادب سے متعلق انجمنیں
وجود میں آ رہی تھیں۔ کیدار ناتھ آملا نے مظفر آباد میں
"بزمِ ادب" کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ جس کے وہ
ناظم مقرر ہوئے۔ اس انجمن کے قیام کی اطلاع ماہنامہ
"رتن" کے اداریہ میں بڑے اہتمام سے دی گئی۔ جس کے

نتیجے میں موجودہ پاکستانی علاقوں کے علاوہ بہار، اترپردیش اور دہلی کے وسیع علاقوں سے بھی بزم ادب کی رکنیت کیلئے درخواستیں موصول ہونے لگیں۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۱۹۴۷ کا پر آشوب زمانہ شروع ہو گیا۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی ڈاک کا انتظام درہم برہم ہو گیا اور "بزم ادب" مظفر آباد کی سرگرمیاں گرم ہوا کے ان جھونکوں میں بالکل ماند پڑ گئیں۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مظفر آباد کے راستے کشمیر پر منظم پاکستانی حملہ کے سبب وہاں کی اقلیتی آبادی کو ریاست کے محفوظ علاقوں میں منتقل ہونا پڑا۔ کیدار ناتھ آملا کو بھی اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ ہجرت کرنا پڑی۔ ترک وطن کے بعد انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک مشرقی اترپردیش کے ضلع مرزاپور میں قیام کیا اور وہاں اردو لکھنے والوں سے رابطہ بنائے رکھا۔ اس کے بعد وہ طویل مسافتیں طے کرتے ہوئے موجودہ ہماچل پردیش کے ضلع کانگڑہ میں وارد ہوئے۔ وہاں انہوں نے دھرم سالہ سے شائع ہونے والے ایک اردو ہفت روزہ سے رجوع کیا اور اس کے لئے لکھنے لگے۔ اسی دوران نئی دہلی سے شائع ہونے والے مشہور اردو روزنامہ "ملاپ" میں ان کے مضامین کیدار ناتھ کشمیری کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ مضامین جموں و کشمیر کے اکھڑے ہوئے لوگوں کے مسائل کو لیکر تحریر کئے گئے تھے اور ان کی اشاعت سے اکھڑے ہوئے لوگوں کے کاز کو کافی تقویت ملی تھی۔ دھرم سالہ سے ایک اردو

ہفت روزہ کے اجراء کے لیے ڈیکلریشن بھی بھر کر دیا لیکن نامساعد مالی حالات کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے۔ سنہ 1953ء میں جموں آنے پر کیدار ناتھ آملا نے اردو خطاطی کے فن کی مہارت کے لیے مشق کرنا شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اِس قابل ہو گئے کہ کسی اخبار یا رسالے کی کتابت کر سکیں۔ لیکن انہوں نے خوشنویسی کو پیشے کے طور پر نہیں اپنایا۔ بلکہ اس کی مشق شوقیہ کرتے رہے۔

جموں کی صحافتی دُنیا میں کیدار ناتھ آملا نے ایک شذرہ نگار کی حیثیت سے قدم رکھا۔ ان کے شذرات کے۔ن۔ ق اور کے، این کشمیری،، کے نام سے مقامی اخبارات میں چھپتے رہے۔ جن میں ادبی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔ اس دوران ان کے مختصر نوعیت کے ادبی پارے رسالہ "شمع" میں بھی شائع ہوئے جو کہ فلمی دنیا کا ایک مانا ہوا اردو ماہنامہ ہے۔ سنہ 1956ء میں کیدار ناتھ آملا نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور ایک مدرس کے طور پر خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اردو کی درس و تدریس کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ اپنی سروس کے دوران انہوں نے اردو سے متعلقہ کئی ورکشاپس میں حصہ لیا۔ جن میں غیر روایتی طور پر اردو کی تعلیم دینے سے متعلق ایک پرائمر کی تیاری میں نمایاں حصہ لینا بھی شامل ہے۔ یہ پرائمر بعد ازاں سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن جموں نے تجرباتی طور پر شائع کیا تھا اور یہ نہایت کامیاب

قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سٹیٹ انسٹی چیوٹ آف ایجوکیشن جموں کے اہتمام سے منعقدہ کئی ورکشاپوں میں بھی شرکت کی اور تصنیفی کام سر انجام دیا۔ جن میں کئی درسی کتب شامل ہیں اور جن کا نمایاں ریکارڈ سٹیٹ انسٹی چیوٹ آف ایجوکیشن جموں کی مختلف اشاعتوں میں موجود ہے

کیدار ناتھ آملا نے ۱۹۷۶ء میں آل انڈیا ریڈیو نئی دھلی کے اہتمام سے ریڈیو کشمیر جموں کے احاطہ میں منعقدہ ایک اہم ترین ورکشاپ میں بھی حصہ لیا۔ اس ورکشاپ میں سکول براڈکاسٹ سے متعلق مواد اور تکنیک پر کی گئی نئی کھوج کے تحت شرکائے ورکشاپ کو تربیت دینا مقصود تھا۔ اس ورکشاپ میں جو پہلا سکول براڈکاسٹ مضمون پیش کیا گیا وہ کیدار ناتھ آملا ہی کا تھا جو کہ تاریخی مواد پر مبنی تھا۔

اور جس کا عنوان "فاہیان کی ڈائری" تھا۔ یہ مضمون شستہ اردو میں تحریر کیا گیا تھا۔ اور نئی تکنیکوں کے عین مطابق تھا اس لئے اسے بے حد پسند کیا گیا اور اس ورکشاپ میں آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے آنے والے اعلیٰ عہدیداران جناب مصر اور جناب کمال صدیقی نے اسے بے حد سراہا۔ یاد رہے کہ جناب کمال صدیقی ہندوستان کے مانے ہوئے اردو مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔

اور آج کل ان کے مضامین اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں
فروری سنہ 1986ء میں۔ 32 سالہ سرکاری سروس سے سبکدوش
ہونے کے بعد کیدار ناتھ آملا نے جموں کے ایک روزنامہ "تسکین"
کی ادارت سنبھالی۔ اس سے قبل بھی وہ دو روزنامول
"اُجالا" اور "عمارت" میں ادبی خدمات انجام دے
چکے تھے۔ "اُجالا" میں اُس وقت ادبی خدمات سر انجام
دی تھیں جب اس اخبار کے مالک وایڈیٹر مرحوم لالہ امرناتھ
ملہوترہ ہوا کرتے تھے۔
کوئی چھ ماہ تک کام کرنے کے بعد "تسکین" سے علیحدگی اختیار
کرلی۔ جموں سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "عوامی دور"
میں " نارد جی کا پریم پتر ،، ان کا مستقل کالم تھا۔ اس جریدے
کے "شہید نمبر ،، اور "شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نمبر ،، میں ادبی نوعیت
کی قلمی معاونت کی۔ اسی طرح "نئی زندگی ،، اور "جناب"
کے کالموں میں ان کی نگارشات اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔
ان دنوں کیدار ناتھ آملا اپنی یادداشتوں پر مبنی ایک
کتاب لکھ رہے ہیں۔ جس کا مسودہ ابھی زیرِ تکمیل ہے۔ اگر یہ
کتاب شائع ہو گی تو یہ ان کی پہلی کتابی اشاعت ہوگی۔

دینا ناتھ رفیق

چودھری دینا ناتھ رفیق پونچھ کی ان برگزیدہ اور نامور ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ جن پر بجا طور پر ناز کیا جا سکتا ہے۔ آپ نہ صرف محکمہ تعلیم کے ایک ممتاز تجربہ کار اور مقتدر استاد ہی رہے ہیں بلکہ ایک اعلا پایہ کے ادیب۔ ایک اچھے مفکر۔ ایک معروف افسانہ نگار اور مسلمہ قابلیت کے شاعر بھی ہیں۔ درس تدریس کے میدان میں آپنے یہ طولے تو حاصل کر ہی لیا تھا۔ شعر و شاعری میں بھی آپ ریاست جموں و کشمیر کے صفِ اول کے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ اعلا درجے کے مقرر بھی ہیں۔

اپنے وطن کی کسی بھی تقریب میں عوام ان کے کلام بلاغت نظام یا تقریر دل پذیر سے مستفیذ ہونے کے لئے چشم براہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو کشمیر جموں اور کلچرل اکیڈیمی آف آرٹ اینڈ لٹریچر میں آپ درجہ امتیاز کے حامل ہیں۔ اس سے قبل بھی آپ اپنی تخلیقات کا مجموعہ "سنیل دریچاں" کے نام سے شائع کرا چکے ہیں۔ اور اب اپنی کاوشوں کا دوسرا سلسلہ بتقریب منظر عام پر لا رہے ہیں۔ جو بلا شک و شبہ بہ نظر تحسین دیکھا جائے گا۔ آپ کا جنم اکتوبر ۱۹۲۵ء بکرمی

مطابق سنہ 1905ء کو تحصیل حویلی کے موضع ہوتر میں ہوا۔ پندرہ
برس کی عمر میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹریکولیشن
امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا۔
اور اپنی جماعت میں سب سے اوّل آئے۔ سنہ 1922ء میں
گورنمنٹ ہائی اسکول پونچھ میں بطور ٹیچر تعینات ہوئے۔ ریاست
کے مختلف مڈل اور ہائی اسکولوں میں مختلف عہدوں پر کام
کرتے ہوئے سنہ 1965ء کو ریٹائرڈ ہوئے۔ آپ محکمہ تعلیم میں
ایسا نام پیدا کیا کہ ریٹائرڈمنٹ کے چھ دن بعد ہی آپ کو
خالصہ ہائی اسکول جموں میں سیکنڈ ماسٹر کی پوسٹ حاصل
ہوئی۔ اور پھر سناتن دھرم ہائر سکنڈیری اسکول جموں میں
روز افزوں شہرت کے باعث ٹیچر مقرر ہوئے۔ خانگی حالات
نے انھیں زیادہ عرصہ جموں میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی اور
آپ گھر واپس آئے۔ یہاں سناتن دھرم مڈل اسکول کو ہائی
اسکول میں تبدیل کر کے بطور ہیڈ ماسٹر کام کرنا شروع کیا
اور آخر میں اسلامیہ مڈل اسکول پونچھ میں بطور ہیڈ ماسٹر
دس سال کام کرتے رہے۔ نظر کمزور ہوجانے کے باعث آپنے
استعفٰی دے دیا۔ آپ کے شاگردوں کا دائرہ ریاست
جموں وکشمیر سے مدارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اور وہ آجتک

اپنی عقیدت کا اظہار کرتے چلے آ رہے ہیں،

شعر وشاعری کا شوق آپ کو آٹھویں جماعت سے شروع ہوا۔ آپ نے چھوٹے چھوٹے بھجن لکھنے شروع کیے اور مذہبی تہواروں پر انھیں مختلف سبھاؤں اور انجمنوں میں گا کر سنانے لگے۔ سب سے پہلی نظم انھوں نے سترہ سال کی عمر میں رامائن پر لکھ کر سناتن دھرم سبھا پونچھ کے سالانہ جلسہ پر پڑھ کر سنائی۔ وہ اتنی مقبول ہوئی کہ پونچھ کے تمام مذہبی انجمنوں اور سوسائیٹوں نے انھیں اپنے جلسوں میں مدعو کرنا شروع کیا اور بڑھتے بڑھتے ان کی مقبولیت یہاں تک پہنچی کہ سکھوں کا جلسہ ہو یا ہندوؤں کا۔ مسلمانوں کا ہو یا شیعوں کا۔ ہر جگہ سے آپ کی نظم یا تقریر کی فرمائش ہوتی۔

ریٹائرڈ ہونے کے بعد آپ جموں چلے گئے اور وہاں پنڈت موتی لال جی نہرو کی صد سالہ برسی پر جو نظم آپ نے پڑھ کر سنائی، اُس نے ہر طرف سے آپ کو خراج تحسین حاصل ہوا۔

رفیق صاحب کا نمونۂ کلام

غزل

رنج و آلام میں گو آج بسر ہوتی ہے — شب تاریک کی آخر تو سحر ہوتی ہے

ضبط میں لب بھی سیئے رہتے ہیں اپنے لیکن — اشک ڈھلتے ہیں تو دنیا کو خبر ہوتی ہے

لاکھ پردوں میں چھپائے پھرو تم عشق کی بات — یہ خبر ایسی ہے بے تار نشر ہوتی ہے

مال بھی تم پہ لٹا بیٹھے متاعِ دل بھی — پوچھتے کیا ہو کہ کس طور گزر ہوتی ہے

ساتھ دیتی نہیں ہر حال میں اچھی قسمت — چھاؤں ہے گا ہے اِدھر گا ہے اُدھر ہوتی ہے

دل کی گہرائی میں ملتے ہیں اُتر جائے جو — وہ فقط اپنے ہی دلبر کی نظر ہوتی ہے

سیج پھولوں کی نہیں عشق کسی سے کرنا — یہ مہم جان کی بازی پہ ہی سر ہوتی ہے

دل کی تخریب کا کیوں تم نے ارادہ باندھا — یہ وہ بستی ہے جو محبوب کا گھر ہوتی ہے

تیری تو سجدوں پہ موقوف نماز ہے اے شیخ — اپنی جب ہوتی ہے با دیدۂ تر ہوتی ہے

گھر کے لوگوں سے بگڑ بیٹھو نہ دنیا والو — مادہ جب آن بگڑ جائے تو شر ہوتی ہے

اہلِ عصیاں کی سنور جاتی ہے جس سے دُنیا
اُسے رفیق وہ تو فقط اُس کی نظر ہوتی ہے

رہبر جدید

ہماری ریاست کے صوبہ جموں نے اُردو زبان کے بہت سے ایسے شعراء پیدا کئے ہیں جنہوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے اور جن کی تخلیقات کو اُردو ادب کے شیدائی بہت ہی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ان ہی شعراء میں شری جگدیپ بہادر سوری رہبر جدید بھی شامل ہیں۔

رہبر جدید محکمہ پولیس کے ایک آفیسر ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ محکمہ پولیس کا علم و ادب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اس کے باوجود اس محکمہ میں رہبر جدید ایسے بلند پایہ شاعر کی موجودگی واقعی انتہائی حیران کن ہے اس پر اگر محکمہ پولیس فخر کرے تو بے جا نہ ہوگا۔

جگدیپ بہادر سوری ۱۵ فروری 1938ء کو ریاست جموں و کشمیر کے عظیم رہنما سوشل ریفارمر فلاسفر اور ریاست میں ہندی تحریک کے بانی کوی شری بنسی لال سوری (مرحوم) کے گھر پیدا ہوئے ریاست کا وہ گھرانہ ہے جس میں گذشتہ نصف صدی سے علم و ادب کی آبیاری ہو

رہی ہے۔ رہبر صاحب اوائل عمر میں ہی اپنے والد محترم کے ذریعہ یوتھ آرگنائزیشن سے منسلک ہوگئے۔ جو ملک کی آزادی کے لیے قائم کی گئی تھی۔ آپ پیس بریگیڈ کے اہم والنٹیئر تھے اور کلچرل فرنٹ کے سیکریٹری بھی 1955ء میں جموں وکشمیر یونیورسٹی سے رہبر جدید صاحب نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ابتدائی تعلیم رنبیر ہائی اسکول اور کامرس کالج جموں میں پائی۔ 1958ء میں کانگریس سیوادل کو منظم کیا۔ 1947ء کے بعد آپ نے اردو میں شائع ہونے والی کتابوں میں دلچسپی دکھائی۔

شعر گوئی تقریباً 36 سال کی عمر میں شروع کی آپ کو جناب پنڈت رگھبیر داس ساحر سیالکوٹی کے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ ان کا کلام ملک کے معیاری جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ جیسے ان کے تخلص سے ظاہر ہوتا ہے "جدید" ماحول سے بہت متاثر ہے اور جدت پسند ہے۔

ان کا شعری مجموعہ "ضیا بار" کی اشاعت 1969ء میں ہوئی۔ اس کے بعد 1972ء میں "طلوع جام" منظر عام پر آیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کی شروعات 1956ء سے کی۔۔۔

رہبر جدید اُردو ادب کے اُن نقادوں سے بھی متفق
ہیں جن کا کہنا ہے کہ اب اُردو غزل کا مزاج
ہی بدل دیا جاتا چاہیئے اور اب اُردو غزل کا ہر شعر آخر
عاشقانہ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننا چاہیئے بلکہ
زندگی کی تگ ودو میں بانگ درا کا کام بھی دینا چاہیئے۔
"کریم ناز" ان کا مجموعہ کلام زیر طبع ہے۔
ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اگر ان تمام
اخبارات اور جرائد کی تحریریں یکجا کی جائیں تو رہبر جدید
کی شاعری شخصیت اور سیاسی و نجی زندگی کا ایک عجیب
و غریب مجسمہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ جن میں زندگی کے انقلابات
خیالات کی پاکیزگی شاعری کی معراج کے علاوہ رنج وغم کا
بے پناہ سرمایہ بھی ملے گا۔
ان کی رہائش گاہ ایک ادبی مسند ہو کر رہ گئی ہے۔ انکے
عقیدت مند اور عزیز دوست انھیں "گرو جی" کہہ کر پکارتے
ہیں۔ وہاں ان کے ہم عصر ان کے ترقی پسند نظریہ حیات
اور انقلابی کلام کے باعث "مجاہد قلم" بھی کہتے ہیں۔ انکی
وجہ سے ریاست کے اندر اور باہر ریاست جموں وکشمیر
کی عزت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

رہبرِ جدید کی ایک غزل "کیبرے گرل" ملاحظہ فرمائیں۔

کلیوں میں ذرا آکر تو دیکھیں مغربی دھن پر
حنائیں لباس نیم عریاں میں یوں رقصاں ہیں
اشاروں ہی سے اکثر عشق فرماتے ہیں زر والے
شراب ناب ڈولے ہوئے اب دین و ایماں ہیں
جوانی جھومتی انگڑائیاں لیتی ہے پہلو میں
حنائیں لپٹ کر عاشقوں سے رقص کرتی ہیں
ہوس کی آگ میں جلتے نظر آتے ہیں رو سائے
یہ جام زندگانی میں شراب عشق بھرتی ہیں

— — — — — — — — —

— — — — — — — — —

یہاں پتھر کے دل بھی موم کی صورت نظر آئے
حسین جسموں کی آخر آنچ سے یکسر پگھلتے ہیں
نکلتا ہے یہاں آکر ہی دیوالہ تمدن کا
یہیں پر ہاں "یہیں" تہذیب" کے دامن بھی جلتے ہیں
یہی ہوٹل، کلبیں آج مسکاروں کے اڈے ہیں
یہ عصمت لوٹنے والوں کے زرداروں کے اڈے ہیں۔

راجن سرحدی

آپ کا پورا نام راجندر ناتھ ننده راجن سرحدی ہے،
آپکا تعلق جموں کے ننده دیوان خاندان سے ہے جو تقریباً
ستر 70 برس پہلے ایمن آباد (پاکستان) ہجرت کر گیا تھا
اور وہاں آپ کے والد دیوان گھیلا رام ننده صوبہ سرحد
(مغربی پاکستان) میں بہ سلسلہ روزگار ٹھیکیداران جنگلات
اور سوداگران چوب رہے۔ 23 جون 1935ء کو آپ کا
جنم ایبٹ آباد میں ہوا۔

تقسیم وطن کے بعد آپ بھی اپنے والدین کے ہمراہ بریلی
(یو۔پی)، یمنا نگر، ہریانہ، پٹھان کوٹ (پنجاب)، اور آخر
کار جموں میں مقیم ہوئے۔ بیوپاری رجحان نہ ہونے پر بھی
آپ نے اپنے والدین کے کاروبار یعنی عمارتی لکڑی کے بیوپار
میں شمولیت کی اور اسے ہی آج تک اپنی روٹی روزی
کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

آپ کو بچپن ہی سے اردو سے والہانہ عشق ہے اور اسی
عشق صادق نے اردو شاعری کی طرف مائل کیا۔ اور
پنجاب یونیورسٹی کے ادیب فاضل امتحان میں فرسٹ

کلاس فرسٹ آئے۔

ابتدائی شاعری ۱۹۵۴ء میں شروع کی اور علامہ کوثر میرٹھی صاحب کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ آپ کو شاعری کے علاوہ صحافت سے بھی خاص لگاؤ رہا ہے۔ آپ کو ادھر ہی میں ہفتہ وار "گرخیا" یمنا نگر (ہریانہ)، ماہنامہ "سُدرشن" سہارنپور، "شانِ پنجاب" میرٹھ کی ادارت کا فخر حاصل ہے۔

1959ء سے 1963ء تک ٹمبر گزٹ آف انڈیا انگریزی کمرشل ماہنامہ کے چیف ایڈیٹر رہے۔

دورانِ قیام میرٹھ کئی عظیم الشان مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1956ء میں مستقل طور پر پٹھانکوٹ تشریف لے آئے یہاں بھی بزمِ سخن قائم کی اور نوجوانی ہی میں اس بزم کے روحِ رواں رہے۔ اور کئی ہنگامی اور یادگار شعری محفلیں سجائیں اور ملک گیر مشاعروں کا انعقاد کیا جس میں حضرت جوش ملیانی، قبلہ پنڈت میلا رام وفا۔ حضرت رتن پنڈوری صاحب۔ حضرت علامہ قیس جالندھری صاحب کے علاوہ ان کے ہم عصروں نوجوان شاعروں میں جناب بدری ناتھ کامل جناب راجندر ناتھ رہبر جناب عرش صہبائی۔ جناب بکش کاشمیری جناب عابد مناوری

جناب طالب ایمن آباد۔ جناب درباری لال۔ جناب کنول سیرکٹی وغیرہ ان کی صحبت میں آئے اور خوب شعر و ادب کی خدمت کی۔

آپ 1957ء سے باقاعدہ طور پر لسان الاعجاز رانح کوئی پنڈت میلا رام صاحب وفا کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے اور ان سے باقاعدہ طور پر فنی اصلاح کی اور باریک شعری نکتوں کو سمجھا۔

1969ء سے مستقل طور پر اپنے پرانے وطن جموں میں قیام پذیر ہیں۔ آپ کا کلام ملک بھر کی مشہور اخبارات کے علاوہ خالص ادبی رسالہ جات جس میں نیا دور لکھنؤ۔ تعمیر سرینگر بیسویں صدی "نئی دہلی" "شمع" نئی دہلی "شاعر" بمبئی وغیرہ میں شائع ہو کر اردو کے حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکا ہے ریڈیو کشمیر جموں۔ آل انڈیا ریڈیو اردو سروس نئی دہلی سے بھی آپ کی تحقیقات نشر ہو چکی ہیں اور دور درشن جالندھر کے ایک اردو مشاعرہ میں بھی حصہ لے چکے ہیں۔

آپ کی شاعری کا تیس سالہ نچوڑ ایک شعری مجموعہ درد کی سوغات کے نام سے منظر عام پر ہے۔

راجن سرحدی آج کس مقام پر کھڑے ہیں۔ ملک کے

برگزیدہ شعرا حضرات کے تاثرات درج ذیل ہیں جس سے راجن صاحب کا مقام متعین ہو سکتا ہے۔

لسان آسند۔ راس الادیا۔ ابو البلاغت قبلہ رتن پنڈوری صاحب فرماتے ہیں۔" راجن سرحدی لسان الاعجاز پنڈت میلارام صاحب وفا کے برگزیدہ اور سر برآوردہ تلامذہ میں سے ہیں آپ نے اپنے استاد محترم کے نقش قدم پر چلکر اُن کے لگائے ہوئے پودے کو بارآور اور گلریز کر دیا ہے تغزل اور تخیل اور زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ سطحی و مبتذل خیالات، احساسات کی رکاکت سے پاک و صاف کر کے اُسے اس ارفع مقام پر پہنچایا ہے کہ مجاز قارئین کو والا و شیدا کر رہی ہے۔ آپ کے کلام میں سادگی۔ سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی۔ صحت محاورہ۔ نشست الفاظ چستی بندش۔ جذبات صالحہ کے ساتھ ندرت، تازگی اور اثر کی فراوانی ہے۔

پنجاب کے ممتاز شاعر پروینر آزاد گلاٹی صاحب کے خیال میں "راجن سرحدی کے کلام کا کلیدی موضوع محبت اور اس کی متنوع کیفیات ہیں جن سے گزرنے کا تجربہ انھیں محبت کی بدگمانیوں، خوش گمانیوں اس کی محرومیوں اور کامرانیوں، اس کی اذیتوں اور سرشاریوں اور اس کے

عطا کردہ نشاطِ غم اور غمِ نشاط کے اس کھٹے میٹھے زندگی ہی کا ذائقہ ہے!

راجن سرحدی کا مجموعہ "درد کی سوغات" سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجن صاحب نے اپنے عظیم استاد (قبلہ پنڈت میلا رام صاحب وفاؔ) کے رنگ سے ہٹ کر نئے لب و لہجہ میں غزلیں اور نظمیں کہی ہیں لیکن پھر بھی اس کے یہاں مسلمہ روایات کی پابندی بدستور موجود ہے۔

راجن صاحب اردو زبان کے وہ شاعر ہے جو اپنے جذبات کی صداقت میں مکمل یقین رہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے جذبوں کے اظہار میں کبھی منافقت سے کام لینا گوارہ نہیں کرتا ہے۔ وہ صاف گو ضرور ہے مگر دل آزاد نہیں۔

جناب عرش صہبائی صاحب جو ریاست جموں و کشمیر کے پختہ گو، کہنہ مشق اور محبوب شاعر، جناب سرحدی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"راجن سرحدی لسان الاعجاز پنڈت میلا رام وفاؔ مرحوم کے وافر تمیز شاگردوں میں سے ہیں لیکن انھوں نے ادب کے میدان میں اپنی محنت اور لگن سے نام پیدا کیا ہے ان کی طبیعت میں قدرتی صلاحیتوں کا خزینہ موجود ہے یہی وجہ ہے کہ وہ شعر خود نہیں کہتے بلکہ شعر اپنے آپ ان سے کہلوائے

میں جسطرح راجن صاحب کی زندگی میں کسی قسم کا تصنع نہیں
اسی طرح ان کی شاعری میں بھی کوئی بناوٹ نہیں۔
صوبہ جموں کے یہ پختہ گو شاعر نگاہ روشن قدم استوار
رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی
بھی۔ اچھا فنکار اپنے عہد کا رفیق اور ہمراز ہوتا ہے۔
اس کی خود اپنے دل کی ہی نہیں قارئین کے دل کی آواز ہوتی
ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قاری کو ان کلام دل کی دھڑکن
محسوس ہوتا ہے۔
مختصراً راجن سرحدی کو محبت کی تعینات اور اسکے
مختلف ابعاد کے اظہار پر قابل رشک دسترس حاصل ہے۔ یہ
اپنے محسوسات کو مترنم بحروں، ردیفوں اور قافیوں
سے فنکارانہ انتخاب و استعمال اور الفاظ کے مزاج کی شناخت
سے بے حد موثر بنا دیتے ہیں۔

غزل

کسی کی راہ میں پلکیں بچھا کے دیکھ ذرا
چراغِ رسمِ محبت جلا کے دیکھ ذرا

میں تیرے قرب کی لذت نہ تجھ سے مانگوں گا
فقط تو دُور ہی سے مُسکرا کے دیکھ ذرا

ہر ایک لمحہ وہی شخص یاد آئے گا
اُسے تو اپنی ضرورت بنا کے دیکھ ذرا

ہر ایک دل میں ہے کعبہ بھی اور کاشی بھی
نہ ہو یقین تو گردن جھکا کے دیکھ ذرا

ترا ہی رُوپ سجا دے گی تیرے ہونٹوں پر
میری کوئی بھی غزل گنگنا کے دیکھ ذرا

چھپا نہ دل کے تقاضے کو ان سے راجن
تو لب پہ حرفِ تمنا تو لا کے دیکھ ذرا

غزل

وہ جس ساغر پہ میرا نام لکھنا
لبوں سے بھی کوئی پیغام لکھنا
کوئی بھی حادثہ در پیش آئے
ہمارے نام ہی الزام لکھنا
مبارک ہو تمہیں پردہ نشینی
ہمیں گر شاعر بدنام لکھنا
خلوص دل کی قیمت کیا ہے یارو
وفا کا آج کیا ہے دام لکھنا
نہیں فرصت ہمیں آوارگی سے
مگر پھر بھی ہمیں کچھ کام لکھنا
اُسی کا کرنا، ذکرِ خیر ہر دم
اُسی کا احترامًا نام لکھنا
کبھی لکھنا فسانہ لے لبی کا
کبھی دردِ دلِ ناکام لکھنا
بہت بے چین ہو جاؤ تو راحتؔ
ہزاروں بار اُس کا نام لکھنا

رحم دِل

بڑا ہی رحم دِل ہے وہ شخص
جو رات دن
کتنے مفلسوں کو، غمزدوں کو
تشنہ لبوں کو
کچی بھٹی کی، تیز ڈگری کی
سستی دارو کو بیچتا ہے
بڑا ہی رحم دِل ہے وہ شخص

عابد مناوری

اصلی نام۔ گوری نندن سنگھ بالی
تخلص۔ آبائی وطن مناور کی نسبت سے عابد مناوری

عابد مناوری رائزادہ برکت رائے بالی کے ہاں 27ر مئی 1938ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔
میٹرک پاس کر کے ملازمت اختیار کر لی اور ملازمت کے دوران ہی SAC PART II کی ڈگری حاصل کر کے اکاؤنٹنٹ بن گئے۔ اسوقت آر اینڈ بی کنسٹرکشن ڈویژن جموں میں اکاؤنٹنٹ کے عہدہ پر فائیز ہیں اور گاندھی نگر میں رہائش پذیر ہیں۔
1958ء میں انھوں نے شاعری شروع کی اور ان کی پہلی غزل اگست 1959ء میں ہی انھوں نے کل ہند مشاعروں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔
مارچ 1959ء میں منعقد ہونے والے کل ہند مشاعرے میں انھوں نے جوش ملیانی، تلوک چند محروم، بسمل سعیدی، ناطق گلاؤٹھی اور غلام ربانی تاباں کے ساتھ اپنا کلام پڑھنے کا فخر حاصل کیا۔ 1959ء تا بیسویں صدی میں

چھپنے کے بعد یہ ملک بھر کے تمام مشہور ادبی جریدوں میں چھپنا شروع ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں میں اپنی دھاگ جمانے لگے۔

جہاں تک کسی شاعر سے اصلاح لینے کا تعلق ہے انھیں مشہور شاعر جوش ملسیانی سے فیض اُٹھانے کا شرف حاصل ہے۔ اس وقت یہ تین کتابیں لکھ چکے ہیں۔

پہلی کتاب "بہار غزل" 1971ء میں شائع ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن 1976ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ان کی دوسری کتاب "شمیم گل" 1963ء میں شائع ہوئی اور تیسری کتاب "برجستہ" 1984ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

اُن کی مندرجہ بالا تینوں کتابیں جموں و کشمیر کلچرل اکادمی سے انعام حاصل کر چکی ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب "اے جنت کشمیر" کے نام سے تالیف بھی کی ہے اس کتاب میں کشمیر سے متعلق مختلف شعراء کا کلام درج ہے یہ کتاب سنہ 1976ء میں منظر عام پر آئی تھی۔

غزل

سچ تو یہ ہے پہلے بھی وعدہ نبھایا کون سا
آج لیکن وہ بنائے گا بہانا کون سا

کہکشاں در کہکشاں کب سے ہوں محوِ جستجو
ان میں ہے میرے مقدّر کا ستارا کون سا

تذکرہ گوتم کا ہو یا بھرتری کی داستاں
جو نہیں منسوب مجھ سے وہ ہے قصّا کون سا

نیل گوں آکاش کی اُجلی فضا کو دیکھ کر
پھڑپھڑاتا ہے مرے اندر پر ندا کون سا

ساغرِ زہراب پینا ہی پڑا سُقراط کو
میں نے بھی سچ بول کر انعام پایا کون سا

آپ اپنا سامنا کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کیوں
مجھ سے سرزد ہو گیا ہے جرم ایسا کون سا

آئینے میں خود کو جب دیکھا کھلا مجھ پر یہ راز
چہرہ در چہرہ نہیں جو ہے وہ چہرہ کون سا

شہر کے چوراہے پر ہوں دیدۂ حیرت لئے
میرے گاؤں کی طرف جاتا ہے رستا کون سا

کیوں نہ اے عابد بھنور کی گود میں سو جاؤں میں
پار کرنا ہے مجھے اب اور دریا کون سا

شام لال طالب

شام لال نام۔ تخلص طالب اور قلمی نام شام طالب ہے۔ بقول ان کے "کہہ نہیں سکتے کہ کب سے ذہن و قلب کے خون سے آبیاری شعر و سخن کر رہا ہوں۔ خدا جھوٹا نہ بلوائے، عرصہ 20 سال سے زیادہ ہی ہو چکا ہے قلم کی خدمت کرتے ہوئے"

طالب صاحب پیشے کے لحاظ سے بھی خدمت قلم کی ہی کرتے ہیں۔ یہ شاعری کے ساتھ نثر میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔

ان کا کلام نہ صرف ریاست جموں و کشمیر میں بلکہ ملک اور بیرون ملک کے اکثر رسائل اور اخبارات میں زینت بنا رہتا ہے۔ یہ نہ صرف ریڈیو بلکہ ٹیلی ویژن اور کلچر اکادمی کے علاوہ باہر کی مختلف سرکاری اور نیم سرکاری و غیر سرکاری ادبی تنظیموں کی طرف سے منعقد کئے گئے مشاعروں اور سیمیناروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔

طالب صاحب ریاست کے نامور اور مختلف زبانوں کی ادبی تنظیموں سے بھی وابستہ ہیں۔ یہ ریاست کی نامور

ادبی تنظیم زبانوں کی ادبی تنظیموں سے بھی وابستہ ہیں۔ یہ ریاست کی نامور ادبی تنظیم "نورنگ ادبی کنج" جموں جو ملک کی واحد انجمن ہے یہاں ہر زبان کی آبیاری ملکر کی جا رہی ہے۔ یہ تنظیم عرصہ ۱۰ سال سے ادب کی خدمت سر انجام دے رہی ہے۔ طالب صاحب پہلے اس کے صدر تھے اب بحیثیت جنرل سیکرٹری کام کر رہے ہیں۔

انہوں نے جناب او۔ پی۔ شرما ساربتھی اور جناب جگن ناتھ آزاد سے قلمی رہنمائی حاصل کی ہے۔

جناب ساحر صاحب اور جناب عرش صہبائی سے بھی قلمی تعاون حاصل کرتے رہے ہیں۔

یہاں تک طالب صاحب کی تعلیم کا تعلق ہے انہوں نے جامعہ ہلیہ علی گڑھ سے اردو کی اعلٰی تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ زبان اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور شائقین اردو کو اس زبان کو سیکھنے کی ہمیشہ تلقین کرتے رہتے ہیں اور شائقین اردو کو اس زبان کو سیکھنے کی ہمیشہ تلقین کرتے رہتے ہیں۔

انہوں نے اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی کافی ادبی خدمت کی ہے۔ "زہراب" ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ "میں شو نہیں" ان کے اردو افسانوں کا مجموعہ

ہے۔ اس کے علاوہ "انتخاب سخن" اور سیاہ حاشیے"
یہ دونوں کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔
جموں کی سرزمین کو فخر ہے کہ اس نے شام طالب
جیسے نامور شخصیت کو جنم دیا جو ادب کی خدمت میں
دن رات لگا رہتا ہے۔
ان نمونہ کلام پیشِ خدمت ہے۔

شکستہ ذہن و دل ہے منتشر یہ آئینہ میرا
کہیں ڈھونڈھ کر لا کر میری خاطر کوئی چہرا

عجب احساس میں ہوں مبتلا زخموں کی بارش میں
میں باہر سے بہت کم اور اندر سے بہت بھیگا

مجھے بھی شوق ہے خود کو کبھی میں برہنہ دیکھوں
اُتارا ہے بدلنے سے پیرہن کا بار ہا سایا

اُسے میں ڈھونڈتا ہوں پھر اپنی بوسیدہ حرفوں میں
چھپا رکھا ہے کب سے جیب میں اک کاغذی ٹکڑا

ابھی تک رٹ نہیں پایا میں اپنی ذات کے
کہیں سے مانگ کر لائیں کوئی آسان سا چہرا

بنا کر پھر بگاڑی ہے وہی تصویر ہاتھوں نے
ہمارے ذہن میں کوئی دیکن ہے کوہکن جیسا

یہ کھنڈر کھوج کر تم پا سکو گے کیا بھلا ماخذ
سناتا ہے وہی صدیوں پرانی داستاں چہرا
یہ کیسا زہر لے کر آ گئے امرت کی بستی میں
کوئی مرتا نہیں کوئی نظر زندہ نہیں آتا
تمہارے بند کمرے میں بہت ہے شور و غل طالب
چلو باہر کسی بھی بھیڑ میں ہو جائیں گم تنہا۔

برج موہن ساآجن

پنڈت برج موہن ساآجن ایک مخلص اور ملنسار انسان ہیں ان کے جذبے صادق ہیں۔ ان کے دل میں درد ہے، انسانی درد جو انسانیت کی نمائندگی کرتا ہے، پیشہ کے لحاظ سے بھی وہ معظیم ہیں ایک مدرس ہیں اور اسی لئے ان کی شاعری میں بھی نصیحت ہے۔ دیش بھگتی ہے، بے راہ لوگوں کے لئے ایک پیغام ہے، درس ہے انہوں نے شاعری کا آغاز ۱۹۷۹ میں کیا اور آجتک اردو شاعری کو نکھارنے سنوارنے میں لگے ہیں ان کا کلام اخبارات اور رسالہ جات کی زینت بھی بنا ہوا ہے۔ اور ریڈیو کشمیر جموں سے اکثر نشر ہوتا رہتا ہے۔ فی زمانہ میں گو اردو شاعری، خاص طور پر اردو غزل نے خوب نام کمایا ہے۔ ہر اچھی سوسائٹی میں اردو غزل کے ٹیپ بجتے ہیں اور واہ۔ واہ ہوتی ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو زبان اب کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ اس حالت میں اردو کے لقا کے لئے کوئی ادیب یا شاعر جو کچھ کر رہا ہے غنیمت ہے!

برزخ موہن ساجن کے کلام پر مشتمل ایک شعری مجموعہ "جہانِ فردا" منظرِ عام پر آچکا ہے۔ "جہانِ فردا" کے دو حصے ہیں ایک حصے میں نظم اور دوسرے حصے میں غزل۔ نظم میں وہ قدرتی مناظر کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے "گھٹا برسات کی" اور کسی نظم میں ملک کی تعمیر کو نئی تعمیر سے سجانا چاہتے ہیں اور کسی نظم میں، دیر جوان جو ہمارے دیش کی سرحدوں کے محافظ ہیں کے گن گان دکھائی دیتے ہیں اور "شہیدانِ وطن"، کو کسی نظم میں اپنے شردھا کے پھول ارپن کر رہے ہیں۔

کچھ نظمیں احساسات سے پُراثر ہیں اور ان میں ان کے پاکیزہ خیالات کی بھرپور عکاسی ہے۔

گو ساجن صاحب کا کلام کلاسیکی ادبیت کو بڑھاوا دیتا ہے مگر اپنے شعروں میں نئی بات بھی کہتے ہیں۔ کچھ اشعار چونکا دیتے ہیں۔

اُن کا یہ شعر دیکھئے۔

مِل گئی جب سے قفس کی زندگی
طاقتِ پروازِ بال و پر گئی

انسان کو جب خوشحالی خوشی میسّر ہوتی ہے جب وہ خوشحال ہوتا ہے تو اُسے یہ احساس ہی نہیں دیتا کہ خوشی کے بعد غم اور ملن کے بعد جدائی بھی لازم ہے۔ خدا نہ کرے کہ وقت کا چکّر کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ ان کا یہ شعر انہی خیالات کی عکاسی کرتا ہے

وقت کا چکّر اگر اُلٹا چلا تو دیکھنا

ہو کے رہ جائیں گی یہ نزدیکیاں بھی دُوریاں

اپنے معشوق کی اداؤں پر مر مٹنا عاشق کا صادق جذبۂ محبت ہے اور اسی روایت کو اردو شاعروں نے خوب اُچھالا ہے اپنے محبوب کی ناجائز اور بے جا یا توں پر بھی عاشق جان چھڑکتا ہے۔ یہی آج تک روائتی شاعری کا بہتا ہوتا رہا ہے۔ مگر ساجنؔ صاحب نے اپنے اس شعر میں بہت کچھ روایت سے ہٹ کر کہا ہے۔

اُسے میں کہاں تک مناتا رہوں گا
جسے رُوٹھ جانے کی عادت پڑی ہے

غرضکہ ساجن صاحب کے شعروں میں کچھ نہ کچھ دِل کو چھو لینے والا عنصر ہے۔ اور کیوں نہ ہو آپ ماہر اقبالیات حضرت پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب سے گاہ بگاہ قیمتی اور مفید مشورے حاصل کرتے رہتے ہیں۔ جن کی شاعری کے رہبر حضرت آزاد جیسے رہے ہوں۔ وہ منزل سے بھٹک نہیں سکتے۔ ساجن صاحب نے اُردو شاعری میں مجموعہ کلام لکھ کر اپنے جائے پیدائش گھوڑہ براہمناں (تحصیل سانبہ) کا نام اُونچا کر دیا۔

"نوجوان"

سرفروشوں کا لیے جو چل دیا تھا کارواں
اس کی قربانی سے اب آزاد ہے ہندوستاں
ظلم کی چکی میں یہ پستا رہا صدیوں مگر
لب پہ نغمہ دیش کے پرچم کا ہو اونچا نشاں

سر کٹا اس کا چڑھا سولی پہ بھی لاکھوں دفعہ
پھر بھی زندہ ہے ہمارے دیش کا یہ "نوجوان"

اس نے آزادی کی خاطر کیا سے کیا کچھ کر دیا
گھر کو پھونکا، سر کو بیچا ہے گواہ جس کا جہاں

جس نے آزادی کو سینے میں للکارا کبھی
رکھ دیا اس نے مٹا کر اس کا ہی نام و نشاں

یہ گنگا جمنی ہے یا گوردوارہ ہے آج بھی سکھ کوئی
دیش کی خاطر ہوا جس کا سبھی جان و جہاں

تا قیامت ہو مبارک اب یہ آزادی اُسے
جس کا خادم بھی ہوا یہ اور جس کا پاسباں

جشنِ آزادی کا مل کر پھر منائیں اس طرح
آج پھر جھوم اٹھے زمیں جھوم اٹھے سارا جہاں آسماں

غزل

باغباں کے گھر میں بھی کانٹے بھرے دامن ملے
دوستو کے بھیس میں ہمکو یہاں دشمن ملے
میں کبھی چہرے کو سنواروں گا تمہاری ہی طرح
گر کوئی جیسا تجھے ویسا مجھے درپن ملے

کر رہا ہے داد کے نزدیک پھر کوئی دعا
آج پھر کل کی طرح کوئی مجھے گردن ملے
عمر بھر یہ التصور تھا کنوارا ہی رہوں
وقت کا چکر تھا جب سوچا کہ اب دلہن ملے

بوند بھر پانی کو بھی ترسے اگر برسات میں
پھر تقاضا کیوں کرے دھرتی کے اب ساون ملے
زندگی میں پا سکیں گے پھر جوانی کا جنون
گر ضعیفوں کو بڑھاپے میں گیا بچپن ملے

دشمنوں کے دل میں ایسا تخیل تھا میرا
اب ملوں اس حال میں اس حال میں ساجن ملے

کیول کرشن شاکر

دھان کے کھیتوں سے لہرانے والی تحصیل رنبیر سنگھ پورہ کی سرزمین پر ۱۱ر نومبر ۱۹۳۶ء کو ایک بچے نے پنڈت جگن ناتھ کے گھر جنم لیا۔ گھر والوں نے کیول کرشن نام رکھا۔ مگر عوام ان کو صرف کیول کے نام سے پکارنے لگے۔ دسویں جماعت کا امتحان انہوں نے رنبیر سنگھ پورہ ہائی اسکول سے پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں گاندھی میموریل کالج میں داخل لیا کالج کی پڑھائی کے بعد انہیں کچھ کر دکھانے کا جذبہ ایک سیاسی کیمپ میں کھینچ لے گیا۔ مگر سیاست سے زیادہ دیر تک لگاؤ نہ رکھا۔

پھر یہ محکمہ تعلیم میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں یہ شاکر بن گئے۔ انہوں نے اسی زمانے میں لکھنا شروع کیا۔ شروع میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔ ان کی پہلی اردو کہانی "گڑیا" روزانہ ترجمان لدھیانہ میں ۷ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی کہانیاں نہ صرف روزانہ ترجمان میں شائع ہوتی رہیں۔

بلکہ مقامی اخبارات کی زینت بھی بنتی رہیں۔

جناب عرش صہبائی کی رہنمائی میں انہوں نے اردو شاعری کی طرف اپنا قدم بڑھایا۔ شاکر صاحب کئی بار جموں میں منعقدہ کل ہند مشاعروں میں شرکت کرتے رہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں مقامی اخبارات کے علاوہ بیرونِ ریاست میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے کلچرل اکادمی اور انفارمیشن محکمہ کے مشاعروں میں اپنے کلام کی داد سامعین سے حاصل کی۔

بقول ادیب کاشمیر آف جرنلسٹ، شاعروں میں اپنی دھاک بٹھاتے ہیں اور ریڈیو پر سامعین کے دل و دماغ کو اپنی تخلیقات سے گرماتے ہیں۔ ان کی وفا شعار اہلیہ سنتوش شرما کو بھی جنہوں نے اپنے شوہر نامدار کی ہمہ گیر شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں بھرپور حصہ ادا کیا ہے۔

شاکر صاحب ۱۹۶۷ء کے بعد پنجابی کی طرف توجہ دینے لگے اور پنجابی میں ابتک ان کے تین کاو سنگرہ شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں "پرچھاواں" "دھرتی دے گیت" اور "سانجھیاں"۔ ان کتابوں میں غزلوں، نظموں کے علاوہ حب الوطنی کی نظمیں زیادہ ہیں۔

شاکر صاحب کا اردو مجموعہ کلام "گلشن گلشن" زیر ترتیب ہے اور جلد ہی اشاعت کی منزلیں عبور کرکے منظر

عام پر آئے گا۔

1978ء میں بہترین مدرس کا اسٹیٹ ایوارڈ اور 1969ء میں پہلا گاندھی میڈل ملا۔ یہاں انھوں نے شعروشاعری میں بلند رتبہ پایا وہیں بہترین مدرس کے انعام سے نوازے گئے دیش پریم اور سادگی کا دامن ہمیشہ تھامے رکھا اور گاندھی وچاروں کا پرچار کرنے کے لیے تمغہ حاصل کیا۔

شاکر صاحب ایک شریف طبع اور مخلص انسان ہیں۔ ان کی شاعری بھی ان کی طرح شریفانہ ہے۔ وہ فن کے پرستار ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔

اُن کا کلام دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ اردو ادب کی خدمت جتنی بھی انہوں نے کی یا کر رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے ایک اچھے شاعر کے کلام میں جو خوبیاں ہونی چاہیں وہ ساری ان کے یہاں موجود ہیں۔ وہ رموز فن سے بھی واقف ہیں اور ان کے کلام میں جا بجا اس کی چھاپ ملتی ہے۔

بقول عرش صہبائی صاحب "شاکر صاحب کا کلام نہایت پاکیزہ اور تعمیری تصورات کا آئینہ دار ہے۔

شاکر صاحب نے اردو پنجابی کے علاوہ ڈوگری زبان میں بھی کام کیا ہے اور اُنہوں نے ڈوگری میں ایک ناول

سرکنڈے نے لکھ کر ثابت کردیا کہ وہ ہر زبان پر عبور رکھتے ہیں ان کے اردو کلام کی کچھ جھلکیاں حاضرِ خدمت ہیں۔

قطعات

ہماری دعا بے اثر ہوگئی ہے
کٹی رات غم میں سحر ہوگئی ہے

وہ گُم سُم بھی خاموش رہتے ہیں لیکن
ہماری اُنھیں تو خبر ہوگئی ہے

اُنھیں گرچہ اقرار سے ہے گریز
مگر ان کے لب پر نہیں بھی نہیں

کبھی اُن کی ہر بات مجھ کو قبول

کبھی دل کو آتا "یقیں" بھی نہیں

—— × ——

تصور میں کوئی سمایا ہوا ہے۔

محبت روگ جاں کو لگایا ہوا ہے

پریشان دل ہے تو ویران نظر ہے

عجیب دل نے صدمہ اُٹھایا ہوا ہے

—— × ——

غزل

کہیں کھُل نہ جائے زباں رفتہ رفتہ

سنادیں انھیں داستاں رفتہ رفتہ

بھلا کیوں نہ ہم نغمہ عیش گائیں

وہ ہونے لگے مہرباں رفتہ رفتہ

چلے ہیں کہاں سے یہ معلوم کس کو

کہ اب چل دیئے ہیں کہاں رفتہ رفتہ

یہ نیچی نگاہیں بتاتی ہیں شاکر

وہ اب ہو رہے ہیں جواں رفتہ رفتہ

بیتاب جے پوری

ایک اچھے شاعر اور اخبار نویس 25 ستمبر ۱۹۴۶ء کو عالم وجود میں آئے۔ اسکول میں داخل ہوئے اور بہت سے برس اسکول کی نذر بھی کیے لیکن کوئی تعلیمی ڈگری سوائے الیف اے کے حاصل نہیں کی۔ شروع شروع میں طبیعت افسانہ نویسی کی جانب مائل تھی۔ اس لئے ادبی دنیا میں ایک افسانہ " پرچھائیں " لے کر قدم رکھا۔ یہ افسانہ "کشمیر" ایک ہفتہ روزہ میں شائع ہوا۔ یہ غالباً ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ اس کے بعد ان کی پہلی غزل ماہنامہ "جگنو" احمد آباد میں ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

جہاں تک ان کے نام کا تعلق ہے بقول ان کے " والدین نے پہچان کے لئے ایک نام رکھا تھا لیکن شاید وقت کو وہ نام منظور نہ تھا اور ہم نے وہ نام بدل دیا اور بیتاب ہوگئے۔ جے پور سے دور کا واسطہ نہیں لیکن جے پوری ہوگئے

Betaab J. Puri

قصہ مختصر یہ کہ ہم ابتدا میں نثر لکھتے رہے لیکن یار لوگوں کو رسالات و اخبارات

کے مدیران کی مہربانی سے یہ [illegible]
بن گیا۔ سو ابھی تک یہی نام چھپ رہا ہے۔
جب یہ حضرت خود کو اسی نام سے یاد کروانا چاہتے ہیں تو ہم یہ کیوں کہیں کہ ان کا پورا نام جے کشن پوری اور تخلص بیتاب ہے۔ بہر حال بیتاب صاحب بقول ان کے "زمانے بھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ریڈیو میں نوکر ہوئے اور پانچ سال تک آل انڈیا ریڈیو جموں سے وابستہ رہے۔
لیکن ایمرجنسی کا چابک ہم پر بھی پڑا اور ریڈیو نے ہمیں خیر آباد کہا۔ تب سے اب تک اخبار نویسی کر رہے ہیں۔
بیتاب صاحب ایک کامیاب اخبار نویس ہیں اور اس وقت ایک روزنامہ "فروغ وطن" کی ادارت کا بار اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ اخبار انھوں نے 1975ء میں جاری کیا تھا۔
جہاں تک صاحب کتاب ہونے کا تعلق ہے ان کا ایک مجموعہ کلام کتابت شدہ پڑا ہے مگر اسے شائع نہیں کروا سکے۔ بقول ان کے شاید کوئی عزیز ہمارے بعد ہمارے کلام کو اکٹھا کر کے چھپانے کی ہمت کرے

تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔
ہم دعا گو ہیں کہ وہ دن جلد آئے جب ان کا مجموعہ کلام ہر صاحب ذوق کے ہاتھوں میں ہو۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

غزل

دیکھئے کون یہ نکلا ہے سفر کو تنہا

کیا بچا پائے گا اس دور میں سر کو تنہا

ہر کوئی جیب میں آنکھوں کو لئے پھرتا ہے

کس لئے پھرتا ہوں میں لے کے نظر کو تنہا

شاید اس دور کا وہ کوئی صحافی ہوگا

اسلئے پڑھتا ہے وہ اپنی خبر کو تنہا

اتنی قربت پہ بھی سورج کا یہ انداز تو دیکھ

چھوڑ کر روز ہی جاتا ہے سحر کو تنہا

اس میں بس جائیگا آسیب کوئی اے بیتاب

روز نکلا نہ کرو چھوڑ کے گھر کو تنہا

آنند سروپ انجم

نام۔ آنند سروپ
قلمی نام۔ انجم

اُودھمپور میں ۱۷ اکتوبر سنہ 1950ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن لڑکپن۔ طالب علمی اور ملازمت کا بیشتر حصہ اودھمپور میں گزرا۔ میڈیکل مضامین کے ساتھ بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ اُردو کا مطالعہ محض مڈل تک ہی ہے۔ دوستوں کی صحبت مشیت ایزدی اور مذاق شاعری نے شعروادب سے وابستگی پیدا کر دی۔ کالج میں مشاعروں کا اہتمام کیا اودھمپور میں انجمن کی شاخ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا مقامی اور ریاستی سطح پر اُردو مشاعرے منظم کیے۔ فیلڈ پبلسٹی اور انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ کے تعاون سے مشاعروں کا اہتمام کیا اور پھر کل ہند مشاعرے منعقد کرنے کی جرات کا بھی مظاہرہ کیا۔

انجمن ادب کی اودھمپور میں شاخ قائم ہونے پر انھیں
اس کا جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ انجمن ادب کی
نشستوں میں حصہ لینے کے لئے رجموں سے ڈاکٹر منظر اعظمی
مالک رام آنند۔ عابد مناوری۔ عرش صہبائی اور میکش
کاشمیری بھی اودھمپور آیا کرتے۔ کلام سناتے اور سونانے
دوستوں کی صحبت میں جدید اصطلاحات۔ جدید تشبیہات
واستعارات۔ نئے رنگ و آہنگ کے شعر کہے۔ اندرونی
کرب اور بیرونی کیفیات کے اظہار کو راہ دی۔
بقول انجم صاحب "آج سے تقریباً سترہ برس پہلے
کی بات ہے۔ میں اودھمپور کے ڈگری کالج میں بی۔ ایس۔
سی کا طالب علم تھا۔ منظور شدہ کورس کی کتابوں کے علاوہ
دوسری کتابیں چاہے وہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں
ہوں۔ شعر و ادب کی تصانیف ہوں یا ناول و افسانوں
مجموعے ہوں۔ باقاعدہ گھر سے پڑھنا اور پھر اپنے حلقہ احباب
میں ان پر بحث کرنا۔ اقتباسات سنانا۔ منتخب اشعار
سنانا۔ کئی مختصر کہانیوں پہروں بیٹھ کر گفتگو کرنا۔
میرے مزاج میں شامل تھا۔ خود بھی شعر کہنے کی سعی کی
چند دوست جو اردو شعر و ادب میں بہت دل چسپی رکھتے تھے

ان میں ساجد۔ نلدیپ صاحب۔ جگل کشور۔ بلراج کمار
اور کرشن صوفی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب لوگ
اردو میں لکھتے تھے اور کچھ مل بیٹھنے کی غرض سے باقاعدہ
طور پر "انجمن ادب" کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ شام افسانہ
شام غزل، مشاعرے، مقامی سطح پر ریاستی سطح پر منظم
کئے جاتے تھے۔ اور شاید اپنی غفلت کی ہم تلافی نہ کر سکیں
اگر محترم پروفیسر سنسار چند صاحب کا نام یہاں نہ لیا جائے
جو گاہے بگاہے۔ اپنی رائے، قیمتی مشوروں سے ہمیں
نوازا کرتے تھے

کلچرل اکادمی کی جزوی مالی امداد سے شعری مجموعہ "
"راستے منزلیں" شائع کرنے کی کوشش میں انجم صاحب
مصروف ہیں۔

انجم صاحب اندرا گاندھی کے بارے میں یوں لکھتے
ہیں:

امنِ عالم کیلئے برسرِ پیکار تھی وہ

دشمنوں سے بھی محبت کا طلبگار تھی وہ

دوستی اور محبت کی پرستار تھی وہ

ظلمت و یاس میں ایک چشمہ انوار تھی وہ

انجم صاحب انگریزی کے ایک قابل استاد ہونے کے ساتھ ساتھ اودھم پور سے اردو کے عظیم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کا مزا لیجیے۔

غزل

نفس نفس بھر گیا بدن میں وہ خار کتنے
مجھے وہ پہنا گیا ہے زخموں کے ہار کتنے

یہ کس نے گذرے ہوئے دنوں کی کتاب کھولی
نکل پڑے آج اشک بے اختیار کتنے

میں آج تک راستوں کی گرد و غبار میں ہوں
تمہارے وعدے سبھی تھے ناپائیدار کتنے

وہ آج کیوں بے تکلفی سے ملا ہے مجھ کو
کہ دُھل گئے دل سے رنج و غم کے غبار کتنے

فلک کے چہرے پہ کوئی بھی داستاں نہیں تھی
مگر زمینوں پہ لوگ تھے بے قرار کتنے

ذرا ہمیں بھی بتاؤ اے ہاتھ کی لکیرو
تمہاری قسمت میں پھول لکھے ہیں خار کتنے

غزل

ایک جھونکا تیز آیا کیا ہوا ۔ انگلیوں سے ریت پر لکھا ہوا

میری آنکھوں میں آنسو تو نہیں ۔ دل میں اک طوفان ہے ٹھہرا ہوا

زینہ زینہ میرے گھر میں کبھی اُتر ۔ رات میں برسوں سے ہوں جاگا ہوا

کشتیاں کاغذ کی ہر اک ہاتھ میں ۔ اور دریا دور تک پھیلا ہوا
تیرا غم دیکھا ہے میں نے آج تو ۔ مجھکو اپنے غم کا اندازا ہوا

کون افشا کر گیا معلوم کیا ہے ۔ راز کو تھا راز ہی رکھا ہوا

کیا خبر گم ہو گیا انکبسم کہاں

وہ ابھی تو پاس تھا بیٹھا ہوا

بلراج کمار بخشی

پورا نام۔ بلراج کمار بخشی

قلمی نام۔ بلراج کمار

۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کو نگروٹہ (جموں) کے مقام پر
پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد پونچھ کے رہنے والے
ہیں جو تقسیم ملک کے وقت پونچھ سے ہجرت کرکے پہلے
نگروٹہ شرنارتھی کیمپوں میں مقیم رہے پھر اودھمپور میں
مکمل رہائش اختیار کرلی۔ عام لوگوں کی طرح بچپن
گزرا۔ پھر زندگی کے مراحل طے کرتے ہوئے میڈیکل
مضامین کے ساتھ بی۔اے پاس کیا۔ پھر قانون کی ڈگری
حاصل کی۔ اب ذاتی کاروبار میں مصروف ہیں۔

شاعری، موسیقی، مصوری اور فائن آرٹ کے
تمام شعبوں سے دلچسپی رہی ہے۔ افسانہ نگاری اور
شاعری کو ذریعہ اظہار منتخب کیا۔ سب سے پہلا افسانہ
"چاندنی کا دھواں" اور پہلی نظم و غزل "شاعر" بمبئی میں
شائع ہوا۔ حوصلہ افزا لگے اور لکھنے کی تحریک
ہوئی اور ابھی تک لکھتے جا رہے ہیں۔ بعد ازاں ہفت روزہ
اخبار "وقار" نکالا جو چند ایک مجبوریوں کی وجہ

سے بند کرنا پڑا۔ آنند سروپ انجم سے گھر سے سراسم قائم ہوئے۔ انجمن ادب کی شاخ کھلی تو بلراج صاحب کو صدر مقرر کیا گیا۔ جموں کے اردو ادباء شعراء کو اندر مہیوریں مدعو کیا مشاعرے ہوئے بلراج صاحب شعری مجموعہ "میرے گناہ سبھی منظر عام پر لانے کی سعی کر رہے ہیں۔
نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

خواب کا دور تک کوئی سایا نہیں
غم ابھی بھی وعدہ شکن ہے بہت
ہوا ہوا اُس کی صورت غزل جیسی ہے
میرے محبوب میں بانکپن ہے بہت
شعر بلراج میں یہ درویش ہے
وہ کہ جس حال میں بھی مگن ہے بہت

اُس ایک جسم میں کیا کیا کہانیوں دیکھوں

کہ زیرِ سطحِ زمیں ساتوں آسمان دیکھوں

اُدھار لیکے نظر دیکھنا نہیں منظور

اور اپنی آنکھ سے منظر دھواں دھواں دیکھوں

ایک جھونکا سبھی کچھ اڑا لے گیا۔

ساری محنت میری رائیگاں ہو گئی

چُھپتی پھرتی ہے بلراج کس خوف سے

زندگی کس لئے بے نشاں ہو گئی

راج کمار چندن

راجکمار چندن دسمبر ۱۹۴۶ء میں موضع بیری تحصیل کوٹلی میں شری دھن راج کے گھر پیدا ہوئے۔ کچھ ناگزیر حالات کی بنا پر ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ جسے اُنہوں نے بعد میں اپنے طور پر مکمل کیا۔ ۱۹۸۰ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا اور اس کے بعد ایم فل میں "جموں وکشمیر میں جدید غزل کی روایت" پر مقالہ لکھا اور ایم فل کی کلاس فسٹ ٹرم گریڈ میں پاس کیا۔

چندن صاحب شعر و شاعری سے اوائل عمر سے ہی لگاؤ رہا اور اسی کی خاص وجہ شاید ان کی غریب الوطنی تھی وہ ۱۵ سال کی عمر میں ہی چلے گئے اور وہاں بھٹکتے رہے ان کی زندگی المناک ایک داستان سی ہے۔

برسوں بعد یعنی سنہ ۱۹۶۷ء میں واپس آ گئے اور باقاعدہ "بزم فروغ اردو" کی نشستوں میں حصہ لینے لگے۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد ان کا کلام ریڈیو پر نشر ہونے لگا۔ اور مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہونے لگا انہوں نے ادبی محفلوں میں بھی حصہ لینا شروع کیا اور کئی مضامین پڑھے جن میں اردو کے علاوہ ڈوگری زبان کے متعلق بھی مقالے تھے۔

چندن صاحب نے ۱۹۸۰ء میں غیر مسلم کانفرنس میں بھی حصہ لیا۔ اس کانفرنس میں ان کے علاوہ جگن ناتھ آزاد، آنند لہر وغیرہ بھی جموں سے گئے تھے۔

چندن صاحب نے ۱۹۸۴ء میں جموں سے ادبی رسالہ "لعطش" جاری کیا۔ یہ رسالہ اردو ادب کے لئے ایک نیک فعال اور جرت مندانہ قدم تھا۔

"العطش" کی اب تک کی اشاعتوں میں جگن ناتھ آزاد نمبر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

۱۹۸۴ء میں چندن صاحب کو ان کے شاعری مجموعے "انجذاب" پر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز جموں و کشمیر کی طرف سے مالی امداد دی گئی۔ یہ مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ اس میں چندن صاحب کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں اور جگن ناتھ آزاد کا تحریر کردہ دیباچہ بھی قابل ذکر ہے۔

چندن صاحب نے زبان اُردو کی خدمت کرنے کا جو بیڑا اٹھا رکھا ہے وہ قابل تعریف ہے انہوں نے اس زبان کی ترویج و ترقی کے لئے سرکاری ملازمت سے انکار کر دیا۔ وہ ایک منبر پر مختلف خیال کے ادیبوں کو جمع کرتے ہیں۔ اور بڑی بڑی شخصیتوں کو مدعو کرتے رہتے ہیں اور ہر وقت ان پر زبان اردو نکھار کی دھن سوار رہتا ہے۔

حیدرانؔ صاحب کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیں :-

غزلیں

کیا وہ تھا میرا کوئی جا نہ ہوا

جس کو دیکھے ہوا زمانہ ہوا

میری آنکھوں کا کرب ہے شاید

ایک لفظ جو دائرہ نہ ہوا

تو نے جو کچھ کیا وہ تھا الہام

میں نے جو کچھ کیا فسانہ ہوا

پیشِ منظر تھا ابر کا ٹکڑا

جانے کس سمت کو روانہ ہوا

پچھلے موسم کو کس طرح رہوں

آج تک مجھ سے فیصلہ نہ ہوا

تلاطم کے تھپیڑے کھا رہی ہے
مگر ناؤ ابھرتی جا رہی ہے

جنہیں مطلوب تھی شبنم کی ٹھنڈک
جمرّں کی دھوپ انھیں جھلسا رہی ہے

پرندوں ڈھونڈ لو کوئی ٹھکانہ
وہ دیکھو پھر سے پت جھڑ آ رہی ہے

ہنسی کا خول ہم اوڑھے ہوئے ہیں
مگر اندر سے دیمک کھا رہی ہے

ابھرنے کو ہیں اب پودے وفا کے
جفا کی برف پگھلی جا رہی ہے

منوہر لال دِل

جناب منوہر لال دِل جموں کے بزرگ شعراء میں سے ہیں۔ آپ کا جنم 27 جنوری 1914ء کو ریاست جموں وکشمیر کی سرمائی راجدھانی جموں میں ہوا۔ ابھی دل صاحب چار برس کے ہی تھے کہ ان کے دادا صاحب دوسری دنیا کو چلے گئے۔ ابھی وہ دس سال کے ہی تھے کہ ان کے والد محترم چندامل آنند بھی خدا کو پیارے ہو گئے والد صاحب کی موت کے بعد دل صاحب کی زندگی دوبھر ہو کر رہ گئی۔ یہ عل ولی محمد جلد ساز جن کی دوکان ڈھکی سرا جان جموں میں تھی۔ سے جلد سازی کا ہنر سیکھا۔ وہاں یہ اسکولوں کے لئے کاپیاں بنانے اور ساتھ ہی ساتھ مشن مڈل اسکول میں تعلیم بھی حاصل کرتے اور اسکول کے بعد بنائی ہوئی کاپیاں بیچتے۔ اس سے جو آمدنی ہوتی اس سے وہ کچھ سکون محسوس کرتے۔ 1950ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1927ء میں پنڈت بیلا رام دفا صاحب تقریباً چھ ماہ تک دل صاحب کے پاس ہی رہے۔ دفا صاحب کی صحبت میں دل صاحب اپنا ہاتھ سیدھا کرتے رہے۔ دل صاحب کی پہلی دل 2 مارچ 1928ء

کو "دیر بھارت" لاہور میں چھپی جس کا ایک شعر تھا۔

رکھا ہوا ہے جو میں نے ہتھیلی پہ سر آج

کچھ خدمت وطن میرے پیش نظر ہے

اس کے بعد دل صاحب مختلف اخبارات میں چھپتے رہے۔ خاص طور پر "ویر بھارت لاہور" ریسر سیالکوٹ" "زمیندار لاہور" "رنبیر جموں" "سدرشن جموں" "شہباز لاہور" "ملاپ لاہور" اور پارس لاہور" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جناب دل صاحب کئی سال تک عارضی طور پر مختلف محکموں میں کام کرتے رہے ہیں جن میں سے دفتر ہاؤسنگ جموں وکشمیر، کسٹم جموں، محکمہ واٹر ورکس محکمہ بجلی۔ اسمبلی دیوانی اودھم پور۔ سب جج کی عدالت آرڈی ننسی ڈیپو لاہور۔ وغیرہ محکموں میں اپنا کام سنہ 1935ء تک بخوبی سنبھالتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری میں اضافہ بھی کرتے رہے۔

سنہ 1935ء سے نومبر سنہ 1941ء تک دل صاحب کریانہ کی دوکان چلاتے رہے بعد ازاں جموں وکشمیر بنک میں بطور کلرک ملازم ہو گئے۔ یکم مارچ سنہ 1975ء کو بطور سینیئر سپرنٹنڈنٹ بنک آف لاہور رشی کیش (یوپی) سے

ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ جیولر فنانس کمپنی میں بطور اکونٹنٹ کام کرتے رہے۔

13 / مارچ 1985ء کو بیمار ہو جانے کے بعد انہوں نے نوکری چھوڑ دی۔

1947ء سے پہلے وہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے اور اپنے کلام کی عوام سے داد پاتے رہے۔ 1947ء کے بعد 1952ء تک جمود طاری ہو گیا۔ پھر مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ ریڈیو کشمیر جموں نے تقریباً ۱۰ ہزار غزلیں نشر کیں جن میں دل صاحب کی کافی غزلیں بیگم اختر نے بھی گائیں۔

دل صاحب خالص تغزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل تمام ایسے مضامین پر مشتمل ہوتی ہے جو اچھے اساتذہ نے غزل کے لئے مقرر کئے ہیں دل صاحب جدید شاعری کی بدعتوں میں ملوث نہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں ایک کلاسکی چاشنی پائی جاتی ہے۔

بقول ڈاکٹر گیان چند جین "آج کے اس پر آشوب دور سخن میں یہ استواری، یہ وفاداری ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں کی طرح ہے" ان کی یہ غزل عہد شباب کی یاد تازہ کرتی ہے۔

دل میں روشن کر محبت کے چراغ

دیکھ یہ تاریک گھر اچھا نہیں

بنتی کبھی ہے ہر روز، بگڑتی کبھی ہے ہر روز

دنیا ہے یہ پردہ آغوش غنا کیا!

پہنچ جاؤں کس طرح ان کی محفل میں

مگر تکلف ہمت شکن سے ڈرتا ہوں

جناب دل صاحب کی قادرالکلامی کا ایک مظہر یہ ہے کہ وہ بارہا لوٹتی ہوئی طویل ردیفوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ بعض ردیفیں کی اشکال انشا و مصحفی کے دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

نالہ دل ہے، اثر انداز، جو چاہے کرے

تو گیا جب تو کسے ہوش رہا تیرے بعد

دلِ صاحب کی شاعری میں لطف یہ ہے کہ کہیں تکرار کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ملکہ اساتذہ کے کلام میں ڈوبے لغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ویسے شاذ و نادر وہ غزل کے شعریہ مطالب سے ہٹ کر بھی کچھ کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً:-

نہ آئیگی نظر امن و اماں کی ملک میں صورت
رگ و ریشہ سے جب تک فرقہ آرائی نہیں جاتی

یہی ہے زیست کا مقصد یہی ہے حاصلِ زیست
نصیب قوم و وطن کا بدل سکے تو بدل

نئے افق، نئے ماحول کا تقاضا ہے
رسومِ کہنہ کا شیوہ بدل سکے تو بدل

یکم مئی ۱975ء کو دلؔ صاحب کے مجموعہ کلام "نقدِ دل" منظرِ عام پر آیا۔ "نقدِ دل" کی تعریف یوں کرتے ہیں مشہور شاعر مکیش کاشمیری فرماتے ہیں۔

"نقدِ دل" گلستانِ اہلِ نظر
کیوں نہ سر آنکھوں پر جگہ دیں اسے
"نقدِ دل" جزرِ جانِ اہلِ نظر
یہ نہیں محض مایۂ تفریح
"نقدِ دل" ہے کلام حضرتِ دلؔ
نقدِ دل" ہے پیام حضرتِ دلؔ"

بقول ڈاکٹر جین "دل بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ جس کا تخلص دلؔ ہو وہ حسن و عشق کا بندہ نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ ان کا کلام آتش و داغ اور ان کے تلامذہ کی یاد دلاتا ہے۔ اس دور میں یہ پختہ کلامی بسا غنیمت ہے ایسے باقیات الصالحات مغتنمات میں سے ہیں۔
دلؔ صاحب نے اپنی غزل میں جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جس کو پڑھ کر ہر انسان شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو سجدہ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

دیر سے سوچ رہا تھا کہ کوئی بات کہوں

شیخ صاحب کے میں افکار و خیالات کہوں

درد میں ڈوبے ہوئے ان کے سیں جذبات کہوں

اور کشمیر کے سُدھرے ہوئے حالات کہوں

شیخ صاحب کا ہمدردی انسانی ہے اصول

شیخ صاحب تو غریبوں کی ہیں قسمت کی وصول

ان کے راستے میں گھبائیں بھی کئی خار ببول

یہ تو تعمیر وطن میں ہی رہیا گے مشغول

اُن کے ہی فیض سے دُنیا میں ہے کشمیر کا نام

اُن کے ہی فیض سے کشمیر کا اُونچا ہے مقام

جس کو بھی دیکھئے چھلکا تا ہے توحید کے جام

یعنی آج ہر ذرہ کشمیر کے لب پہ ہے محبت کا پیام

دلؔ صاحب کتنے وسیع المشرب ہیں اس کا ثبوت ان
کے مرثیے اور سلام ہیں۔ مرثیہ میں دلؔ صاحب زرمیہ
انداز کے قائل نہیں بلکہ مرثیے کے بنیادی موضوع بین
ورثا کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے انیس و دبیر کی طرح
مُسدّس کی صفائی نہ کہہ کر مخمس کا استعمال کرتے ہیں۔
دلؔ صاحب نے نعت شریف بھی لکھیں ہیں۔

آقا جو محمد ہے عرب اور عجم کا
بے مثل نمونہ ہے مروّت کا کرم کا
حاصل ہے جنہیں تیرے غلاموں کی غلامی
لیتے ہیں وہ نام کبھی قہر و جبر کا

جناب منظور کشمیری کی کتاب "سند وشرار کا
نستعلیق کلام" میں جناب دلؔ صاحب کی نعت پڑھنے
کو مل سکتی ہے۔
مندرجہ ذیل غزلیں دلؔ صاحب کی ملک کے مختلف
اخبارات میں شائع ہو چکیں ہیں۔

۱۔ محبت نے کئے نازل عذاب اوّل سے آخر تک
بلائے جاں رہا دورِ شباب اوّل سے آخر تک

(ہند سماچار جالندھر 2 مئی 1950ء)

2۔ آپ نے چھوڑا ابھی کوئی امتحاں فرمائیے
آپ کو کس منہ سے کہہ دوں مہرباں فرمائیے۔

(ہند سماچار جالندھر 28 اپریل 1985ء)

3۔ تدبیر کے ہاتھوں ہی اے دل دنیا کے مقدر بنتے ہیں
مانگی یہ مقدر رہنے سے حسرت کا مقام آجاتا ہے

4۔ شب کو آئے تھے تو کیا آئے تھے اے دل آخر
روٹھے بیٹھے رہے وہ ہم سے سحر ہونے تک

۱۹۷۱ء میں پاکستان نے جو ہندوستان پر حملہ کیا
تھا اس کے بارے میں ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

اِندرا کے سامنے یحییٰ کا اُڑ جائے گا رنگ

اور بنگلہ دیش کو آزاد کروائے گی جنگ

جھک رہا ہے اندرا گاندھی کے قدموں پر جہاں

جس سے بنگلہ دیش اور ہندوستاں ہیں شادماں

جناب دل صاحب نے
زبانِ اردو کی جو خدمت کی ہیں
اور کر رہے ہیں وہ اہلِ زبان پر
احسان ہے۔ وہ شان ہے
جموں کی اور وہ اہلِ جموں کے بیچ عرصے
تک اسی طرح غزل کی پرداخت و نگہداشت
کرتے رہیں اور اسے خطِ مستقیم سے بھٹکنے سے باز
رکھے ہوئے ہیں۔

بے شک بیماری کی وجہ ان کی زندگی چارپائی تک سمیٹ کر رہ گئی ہے۔ مگر آج بھی وہ زبان اُردو کی خدمت دل و جان سے کر رہی ہیں۔ اس قسم کا عظیم اور ہمدردانہ رویّہ رکھنے والا شاعر جموں شہر کو اب تک ملا ہے شاید ہی پھر مل سکے گا۔

عرش صہبائی

نام ہنسراج ابرول
تخلص۔ عرش صہبائی
ریاست جموں وکشمیر میں غزل کہنے والے کئی حضرات ہیں
لیکن عرش صہبائی صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عرش
صاحب ایک باشعور اور سلجھے ہوئے غزل گو شاعر ہیں۔
عرش صاحب کے تین عدد مجموعے "شکست جام"
"شگفت گل" اور "چشم نیم باز" خراج تحسین حاصل
کر چکے ہیں "شگفت گل" کو حکومت جموں وکشمیر کی کلچرل
اکادمی نے سال ۱۹۷۱ء کے انعامی مقابلہ کے سلسلہ میں ساڑھے سات
سو روپے کی گراں قدر انعام سے نوازا ہے۔ اس کے علاوہ انکا
کلام مختلف مرتب شدہ مجموعوں میں شامل کیا گیا ہے۔
ان کے احباب ان کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہیں
حلقہ احباب بہت وسیع ہے۔ بعض احباب نے ان کی ملازمت
کو بھی نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کیا۔ اس کے باوجود
بھی عرش صاحب ان کرم فرماؤں سے خندہ پیشانی
کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں۔
عرش صاحب ادب میں صحت مند رجحانات کے
قائل ہیں۔ صاف گوئی اور حق پرستی ان کی فطرت میں

جس کی وجہ سے کافی نقصان اٹھا چکے ہیں اور اُٹھا بھی رہے ہیں۔ عرشی صاحب اخلاقی قدروں کے پرستار ہیں صہبائی صاحب کو اپنے لہجے پر اعتماد ہے۔ تغزل کی دھیمی آنچ کے قائل ہیں۔ ان کی غزلوں میں جذبے کی شدت بھی ہے اور نغمگی اور شائستگی بھی۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں۔ جن کی دل کشی اور دلآویزی متاثر کرتی ہے۔ آپ بھی کچھ اشعار کا لطف اُٹھائیے۔

آپ کا حسنِ کرم بھی چاہیے۔
اک فقط حسنِ نظر کافی نہیں

وہ تو اچھا ہوا وہ خود ہی کرم کر بیٹھے
ورنہ مشکل تھا کہ ہم سے یہ تقاضا ہوتا

یہ چپ کیسی، لبِ نازک سے کچھ ارشاد ہو جائے
ہم اتنا جان لیں بے اعتنائی کا سبب کیا ہے

استادانہ رنگ، داخلیت ہے اور انداز بیان کا حسن، عرشی صاحب کے کلام میں طہارت اور پاکیزگی ہے۔
ان کے یہاں سہل انگاری نہیں ہے وہ مستقل مزاجی سے غزل کے فن کو اپنائے ہوئے ہیں۔ عرشی صاحب غزل کے امکانات سے بھی واقف ہیں۔ ان کی شاعری کا حسب اور روزِ افزوں درد اور فکر انگریز بنے گی۔
ان کے مجموعے کلام میں اس قسم کے لذیذ اشعار ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ بکھرے ہیں سے مراد یہ ہے کہ منظم اور

منظوم حالت میں موجود ہیں۔ ان کی شاعری سچ بیا جینے کا حوصلہ دیتی ہے ان کی شاعری ہر دور میں زندگی کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔

عرشی صاحب کے سینے میں اسلام کے لئے بے اندازہ درد ہے اسکا ثبوت یہ ہے۔ سیدنا حضرت امام حسین گھرانہ نبوت کی روشنی اور سردار انبیاء ہے کے دوش نشین تھے دنیا میں صرف حضرت حسین علیہ السلام کی شخصیت ایسی ہے جو شہید ہونے کے باوجود دنیا کی پلکوں کا دشوار اظہار نے کے باوصف تاریخ کی عظیم ہستیوں میں سر فہرست ہیں۔ ان کی شان میں عرشی صاحب یوں فرماتے ہیں۔

منظر یہ دل خراش ہیں کیا انتشار کے
ہر سمت اُڑ رہے ہیں بگولے غبار کے
اندار خوب تر تھے ستم نامدار کے
دنیا سے دور ہو گئے دنیا سنوار کے
آواز حق کو زندہ جاوید کر دیا
قربان جان حضرت صد عالی وقار کے
پانی کی ایک بوند کو ترسے ہیں شیر خوار
یہ رنگ بھی ہیں گردش لیل و نہار کے
وہ آندھیاں ستم کی ہیں تدبیر کیا کرے
خاموش ہو گیا ہے کمقدر کبھی ہار کے

لوحِ جہاں پہ ان کا کہیں نام تک نہیں
چھکے پڑے ہوئے تھے جنہیں اقتدار سے
جس رہگذار سے کبھی گزرے میرے حسین
ذرے بھی آفتاب ہیں اس رہگذار کے

عرش صہبائی صاحب کی شعری سفر بہت طویل ہے۔ بڑے زودگو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

ہم نکل سکتے کبھی کو کیوں کر حصارِ ذات سے
حرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا

تم جو چھو لو گے تو بڑھ جائے گی قیمت میری
گیلی مٹی ہوں کھلونا ہی بنا لو مجھ کو

یاس و حسرت آرزو وفا۔ درد و سکون رنج و غم
زندگی کی داستاں کے بس یہی کردار ہیں

سخن پہ بندشیں ہیں تو زباں پہ پہرے ہیں
عجیب منزلوں پہ اہلِ درد ٹھہرے ہیں

جو زندگی میں تشنۂ تکمیل ہی رہی
اُس حسرتِ گناہ کی کیا بات اور ہے

درہم و برہم نہ ہو جائے کہیں دل کا سکون
خواہشوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر باہر نہ دیکھ

دل کبھی ہیں جذبات سے عاری، ذہن کبھی خالی خالی سے
مستقبل کو دیکھ رہے ہیں کتنے لوگ سوال سے

منظر منظر رنگ سہانا۔ منظر منظر شادابی
دل کی وادی مہک اُٹھی ہے، زخموں کی ہریالی سے

سوچ رہے ہیں کاش! کہیں سے جنس وفا کی بھیک ملے
ہاتھوں میں کشکول لئے پھرتے ہیں لوگ سوالی سے

ایسے ٹوٹیں امیدیں دل کی یہ بستی ویران ہوئی
پھر نہ بنے وہ اس کی زینت پھول گرے جو ڈالی سے

کہاں گئی وہ رونق محفل، کہاں گئے وہ ہنگامے
ہر دنیا پامال ہوئی ہے اک دل کی پامالی سے

عرش کہاں سے پہچان سکو گے تم اس درد کے لوگوں کو
باہر سے کچھ اور ہی عالم اندر سے ہیں خالی سے

غزل گو شاعر کو اپنے اندر جو عالم نظر آتے ہیں وہ خارجی عالم کی رنگا رنگی سے کہیں زیادہ دلکش اور حسین ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ شاعر کی دروں بینی اس کی کائنات کے مطالعہ اور مشاہدے سے بے نیاز کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوت

متخیلہ خود مشاہدے کی محتاج ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ
مشاہدے کے ذریعے شاعر کو جو حسین تجربے ہوتے ہیں
وہ اس کے لئے خام مواد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے
وہ اس خام مواد کو تخیل کی بھٹی میں پگھلا کر جذبات کے
سانچوں میں ڈھال لیتا ہے اور ایسی دلکش صورت عطا
کرتا ہے جو تنہا مشاہدے کے بس کی بات نہیں۔ مگر عرش
صہبائی میں غزل گو شاعر کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔
عرش صہبائی کے لب و لہجے کا استفہامیہ انداز کوئی قاری
بھی انہیں محسوس کر سکتا ہے اس کے اشعار پڑھنے پر
پتا چلتا ہے کہ یہ اشعار شاعر کے دل و دماغ کی پوری
طرح ترجمان ہیں

میرے مطابق صہبائی صاحب کے شعری اسلوب کو انتہائی
مترنم، خوش آہنگ، مسرت آفریں، فکر انگیز، ولولہ
خیز اور پُر تاثیر بنا دیا ہے۔

صہبائی صاحب کی شاعری میں وہ اوصاف ملتے
ہیں جو غزل گو شاعر کو عظیم بناتے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ
ریاست جموں و کشمیر میں ایسے عظیم بزرگ شاعر ہیں

اندرجیت لطف

نام۔ اندرجیت
تخلص۔ لطف

اندرجیت صاحب کا ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء کو گوجرانوالہ (پاکستان) میں جنم ہوا تھا۔ اُنہوں نے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان ہندو سبھا کالج امرتسر سے پاس کیا۔ کالج میگزین کے حصۂ نثر کے مدیر رہے۔ ان کا ادبی دور مختصر افسانے سے شروع ہوا ۱۹۴۲ء میں فلم لائن اختیار کی۔ لیکن راس نہ آئی۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے سرجیکل کے سامان بنانے کی ایک فیکٹری لگائی۔ تقسیم وطن کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں جموں چلے آئے اور کاروبار کے سلسلے میں مستقل طور پر یہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اندرجیت صاحب اردو کے مشہور شاعر دیس راج یکیتا کے بھتیجے ہیں۔ اُنہوں نے شاعری میں اپنا تخلص لطف رکھا ان کے کلام کا مجموعہ "برات دل" ان کی شاعری کی منہ بولتی تصویر ہے۔

غزل کا تعلق جذبات اور احساسات سے ہے۔ غم والم سرور وانبساط اور عشق ومحبت سے غزل کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ جو شعراء کافی مشاہدہ۔ گہرا خیال، بلند نظر اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں کامیاب غزل گو ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ

صحیح جذبات اور سچے معاملات فطری تخیل، موثر انداز، درست ترکیب اور چست بندش حسن ادا، لذات بیان شیرینی الفاظ اور صحت زبان غزل کے عناصر ترکیبی ہیں۔ یہ سارے اوصاف ان کے ہاں ملتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلیات جموں و کشمیر کے شعری ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کلام تحت الفظ پڑھتے ہیں لیکن اس انداز پر ترنم کا گماں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ اردو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے یقیناً ایک قابلِ قدر تحفہ ہے، اُن کی غزلیں ملاحظہ فرمائیں۔

غزل

میرے ساقی کی عنایات تمہیں کیا معلوم
کیف زنداں کی خرابات تمہیں کیا معلوم
یہ مچلتے ہوئے جذبات تمہیں کیا معلوم
اک قیامت ہے یہ برسات تمہیں کیا معلوم

ایک انسان کی تقدیر بدل سکتے ہیں
مست آنکھوں کے اشارات تمہیں کیا معلوم
ان کی نظریں میں رہے عالم انوارِ سحر
اُٹھ گیا پردہ ظلمات کا

زمیں پر تاریک گھر نور بنا دیتے ہیں
ایک شاعر کے خیالات تمہیں کیا معلوم
بر لبِ دل پہ مری جان جو چھڑ جائیں
کتنے شیریں ہیں وہ نغمات
لطف انسان کو مفلوج بنا دیتا ہے
اثر گردشِ حالات

تمہاری ہر ادائیں دلکشی معلوم ہوتی ہے
وفا ہو یا جفا اب ایک سی معلوم ہوتی ہے

اب اُن کے دل میں بھی کچھ چاہ سی معلوم ہوتی ہے
جوانی میں محبت لازمی

— — — — — — —

— — — — — — —

ابھی چشمِ کرم اُس کی ہنسی جو مائل بخششیں
ابھی ہم کے گناہوں میں کمی معلوم ہوتی ہے
کسی سے کھنچے پیرا ہے لطف ہے تو چھوڑ دی ہم نے
مگر اب زندگی میں کچھ کمی معلوم ہوتی ہے

ہر شاعر اپنے وقت کا نباض اور آئینہ دار ہوتا ہے ایسی جذبہ کے تحت جناب لطف صاحب کی شاعری پروان چڑھتی رہی ہے۔ آپ کی شاعری مشاعروں کی جان ہے۔ تمام اصناف شعر میں غزل سب سے حسین اور دلکش قسم کی ہے۔ اور شاید اسی لئے آپ غزل کے بنیادی شاعر ہیں۔

—— X ——

میری پسند کے اشعار

طالب خیر نہ ہونگے کبھی انسان سے ہم
نام ہے اسکا بشر اسمیں ہے شر دو بیٹہ تین

ریاضن فن تو عبادت ہے سوز تم اس میں
کہیں بھی خواہش جاہ و جلال مت کرنا

صحبت بد سے بگڑ جاتی ہے اندر کی ہوا
نیک صحبت سے ہی بن جاتا ہے بندے سے خدا

نیک گھر کے طوطا مینا جپیں نام خدا
دشٹ گھر کے جانور بولیں تو بولیں برا

دہر کے پیچھے لگانے کے لیئے
دل کسی دنیا کو سنوارا چاہیئے

جس کا دل ہے نفرت و کینہ کا گھر
اُن کو الفت کا سہارا چاہیئے

دل میں رہ کر ہے پرے ادراک سے تو
خاک میں رہ کر ہے پرے خاک سے تو

ذات تیری قیاس و وہم دور رہی ہے
نزدیک نزدیک ہے، پرے افلاک سے تو

ناچتے تیرے اشاروں پر بنے کٹ پتلیاں!
نشان کبھی تیرا سدا گردیدہ و مسحور ہے

دیا جلاؤ تو دہلیز پر رکھو آزاد
درون خانہ بھی صفر ہو بیرون خانہ بھی

میں کر عنوان عجب چنتا ہوں
اور اشعار نئے بنتا ہوں

مست رہتا ہوں جس خوابوں میں
اپنی ہی نظموں پہ سر دھنتا ہوں

نہیں مجھ سے عابد وہ کچھ خاص دور
فقط زندگی درمیاں ہے میاں

مجھ کو افسوس اِس کلرک نے
شاعری کے نہ کام کا چھوڑا
جب ہستی کا بھی جواب نہیں
ایک ہرن کو بنا دیا گھوڑا

خدا کے نام پر دست و گریباں ہیں خدا والے
بہت کچھ ہے جہاں ذکر خدا خوف کم ہے

دعا کو ہاتھ کیوں اُٹھے میرے تیمارداروں کے
زباں سے کیوں نہیں کہتے کہ امید ستفا کم ہے

نکھرا ہے آج حسن سحر مدتوں کے بعد
جھلکے ہیں چشم نم میں گہر مدتوں کے بعد

ہے کوئی ایسا جو کہدے راز سربستہ ترا
کاش بن جائے مرا دل ایک گل دستہ ترا

پارسا بھی ہے بشر شیطان بھی
کفر بھی سینے میں ہے ایمان بھی
کارنامے دیکھ کر انسان کے
محو حیرت آج ہے شیطان بھی

نکل کے قبر سے یہ دونوں ہاتھ کہتے ہیں
ہمیں تو رہ گئی حسرت اُنھیں گلے لگانے کی

ہزاروں سال سے ہے یوں تو آدمی کا وجود
لگا ہے اب بھی ترستی ہیں آدمی کے لیے

موت کی تجارت کو زندگی نہیں کہتے
آدمی کے دشمن کو آدمی نہیں کہتے

نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لیے
یہ آدمی ہے بڑا زہر آدمی کے لئے

مسافر ہوں سرائے عالم فانی میں آ ٹھہرا
جہاں آب و گل سے دور ہے بے حد وطن میرا

بھارت کی زبانوں میں ہے اُردو تسلیم
جو جانتا ہے کرتا ہے اُس کی تعظیم